صدیق عالم
چینی کوٹھی
صالحہ صالحہ
دو ناول
Mir Zaheer Abass Rustmani 03072128068

صدیق عالم

صالحہ صالحہ

(ناول)

Mir Z

...the pages of the sea
are a book left open by an absent master
in the middle of another life--

from 'Another Life' (Chapter I) by Derek Walcott

1

کہرے میں بجلی کی بتیاں قطار سے ٹمٹما رہی تھیں۔ کھمبوں پر جھکی ہوئی دورویہ عمارتیں اپنی ایک آدھ روشن کھڑکیوں کے ساتھ تاروں بھرے آسمان کا حصہ نظر آ رہی تھیں۔ ہر کھمبا اپنے بلب کے ساتھ دوڑتا ہوا آتا اور اس کے پیچھے چھوٹ جاتا۔ اس کے باوجود کہ اس وقت وہ کافی عجلت میں تھی، بلب کے نیچے سے گزرتے وقت اسے حیرت ہو رہی تھی، یہ بلب جو دور سے اتنے روشن دکھائی دے رہے تھے، قریب آنے پر ان کی روشنی کتنی ماند پڑ جاتی ہے۔ وہ بہت دیر سے بھاگ رہی تھی اور اب اس کے ننھے ننھے پیر جواب دینے لگے تھے۔ اس نے راستے میں کئی ٹھوکریں کھائی تھیں، شاید اس کے پیروں کی انگلیاں لہولہان ہو رہی ہوں، مگر یہ جاننے کا اس کے پاس وقت نہ تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کی دسترس سے دور کسی محفوظ مقام پر پہنچنا چاہتی تھی۔ محفوظ مقام؟ اسے تو اس شہر کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں، پھر وہ کسی محفوظ مقام پر کیسے پہنچ سکتی ہے؟

اسے پتا بھی نہ چلا کب اس کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، سارا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ اس کے دونوں پیروں کی پنڈلیاں نہ صرف پتھر کی طرح اینٹھ گئی تھیں بلکہ انگلیوں کے درمیان ایک عجیب طرح کی چپچپاہٹ آ گئی تھی۔ اب اس کے لیے ایک قدم بھی اٹھانا دشوار تھا۔ آخر کار وہ رک گئی اور اپنے سامنے جھک کر، دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کو تھام کر، کھانستے ہوئے، سانس کو معمول پر لانے کی کوشش کرنے لگی۔ عین اسی وقت ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا اور اسے اپنے ننگے پن کا احساس ہوا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس کی دونوں ہتھیلیاں ٹانگوں کے درمیان چلی گئیں۔ زمین پر اکڑوں بیٹھ کر اس نے اپنی پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی اور چہرہ بازوؤں کے حصار میں چھپا کر سسکنے لگی۔ اس کی دونوں میچی ہوئی آنکھوں کے بنائے ہوئے اندھیرے میں کھمبے اپنی بتیوں کے ساتھ اب بھی تیزی سے گزر رہے تھے۔ ہوا اس کی ننگی پیٹھ پر اپنی تختی رگڑ

رہی تھی، بالوں سے الجھ رہی تھی، ٹھنڈی انگلیوں سے اس کے ننگے بازوؤں کو سہلا رہی تھی، اور رہ رہ کر فحش انداز میں اس کے کانوں میں سرگوشی کر رہی تھی، جبکہ اس کا سایہ سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جانے کتنا وقت گزر گیا ہوگا، اس کے آنسو تھم چکے تھے جب اسے اپنے اردگرد گہرے سناٹے کا احساس ہوا جس میں جھینگر بول رہے تھے۔ گھر، گاؤں، جنگل، نالے یا جھاڑیاں، ان جھینگروں کو کہیں بھی ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا، یہاں تک کہ ایک دن اس نے اپنے بستر سے لگی دیوار کے چھید سے بھی ایک جھینگر کو آواز لگاتے سنا تھا۔ دیر تک جب کچھ نہ ہوا تو ڈرتے ڈرتے اس نے سر گھٹنوں سے اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے رخ پر تقریباً تیس ہاتھ دور ایک کھمبا کھڑا خود اپنے بلب کی روشنی میں کسی لکیر کی طرح تیر رہا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے پیچھے نظر ڈالی۔ تقریباً دس ہاتھ کے فاصلے پر بجلی کا ایک دوسرا کھمبا قدرے ترچھا کھڑا تھا جس سے نکلا ہوا بلب ڈھکن کے نیچے پتنگوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پتنگوں کی منحنی پرچھائیاں کولتار کی سڑک پر ناچ رہی تھیں۔ وہ کھمبے سے نظر ہٹانے ہی والی تھی کہ اس کے پیچھے کچھ انسانی ہیولے تیرتے نظر آئے۔ وہ بہت زیادہ دور نہیں تھے مگر ان کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ اب بھی وقت ہے، کسی نے اس کے اندر سرگوشی کی، وہ لوگ کسی بھی وقت آدھمکیں گے۔ تمھیں بھاگنا ہوگا۔ اپنی ساری قوتِ ارادی مجتمع کر کے اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی، مگر اس کے دونوں پیر پتھر کے ہو چکے تھے۔ اس کے گالوں پر گرم گرم آنسو نکل آئے۔ عین اسی وقت ایک انسانی سایہ اس کے اوپر آ کر گرا۔ یہ اوسط قد کا ایک تنومند آدمی تھا جو اپنے سائے پر جھکا ہوا زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ اس نے بچی کی طرف چہرہ کیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اس آدمی کے پاس تو کوئی چہرہ تھا ہی نہیں، صرف ایک بیضوی ہالے میں تین سوراخ گردش کر رہے تھے، بلکہ ایک سوراخ سے کالا خون بھی ابل رہا تھا۔

''دیکھو تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے!'' اس نے لڑکی کے سامنے اپنی موٹی ہتھیلی کھول دی جس پر اس کی آنکھ کا ڈھیلا رکھا ہوا خود اپنی اندرونی روشنی میں نہا رہا تھا۔ اس سے بھاپ کی لہریں ابل رہی تھیں۔ یہ ایک زندہ آنکھ تھی جس کی نسوں کے جال میں بجلی کے کرنٹ دوڑ رہے تھے۔ جسم سے الگ انسانی آنکھ وہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اللہ اتنی بڑی آنکھ کو اس کے چھوٹے سے گڈھے کے اندر کیسے ڈالتا ہوگا؟ اپنی چیخ روکنے کے لیے اس نے دونوں ہاتھوں سے منھ داب لیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، اس نے اپنی چیخ نہیں روکی تو یہ اس کے جسم کے پرخچے اڑا دے گی۔ ''دیکھو، اس کے ناخن بلی کے

ناخنوں کی طرح تیز ہیں،'' بغیر چہرے والے آدمی نے پلٹ کر اپنی پشت پر کسی کو مخاطب کیا تھا۔ اس کی آواز کسی عورت کی آواز کی طرح مہین اور سُریلی تھی۔ ''اس نے میری ایک آنکھ نکال لی ہے۔''

وہ سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے تو اس کی دونوں آنکھیں نوچی تھیں۔ وہ کیا کرتی، اپنے بچاؤ کے لیے اس کے پاس ان ناخنوں کے علاوہ اور تھا بھی کیا؟ مگر اس طرح کسی کی آنکھ نکال لینا، کیا یہ ممکن ہے؟ وہ سراسر جھوٹ کہہ رہا ہے۔ یہ نقلی آنکھ ہے۔ وہ مجھے ڈرانے کے لیے یہ کھیل کھیل رہا ہے۔

ایک ایک کر کے عمارتوں کی تاریک کھڑکیاں روشن ہوتی چلی گئیں جن میں انسانی ہیولے حرکت کر رہے تھے، جیسے بادل آسمان سے اتر کر انسانی جسموں میں ڈھل گئے ہوں۔ سڑک پر ایک ساتھ کئی لوگوں کے پیروں کی چاپ سنائی دے رہی تھی جو بتدریج قریب آتی جا رہی تھی۔ دھند کی چادر سے ایک لمبا شخص نمودار ہوا تھا جس کے پاس بھی پہلے آدمی کی طرح کوئی چہرہ نہ تھا، صرف تین سوراخ تھے جو گردش کر رہے تھے۔ وہ کھمبے کے نیچے سے گزر کر اس کے قریب آیا اور زمین پر ایڑیوں کے بل بیٹھ کر اپنی سانس درست کرنے لگا۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر وہ اپنی تصوراتی آنکھوں سے بچی کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ آخرکار اس نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔

''تمھیں پتا ہے تم نے کیا کیا ہے؟ اپنی مٹھی دکھاؤ۔'' وہ اس کی داہنی مٹھی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا جو لڑکی نے سختی سے بھینچ رکھی تھی۔ اسے خود پتا نہ تھا وہ کیا چھپا رہی تھی جبکہ اس کی مٹھی میں تو کچھ بھی نہ تھا۔ وہ زیادہ دیر تک اپنی مٹھی بند نہ رکھ سکی۔ مرد کی لمبی استخوانی انگلیوں کے دباؤ سے اس کی منحنی انگلیاں کسی چینی پنکھے کی طرح کھل گئیں اور اس نے بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھا، اس کے ناخن ہیرے کی کنیوں کی طرح چمک رہے تھے جن سے خون کے سیاہ قطرے ٹپک رہے تھے۔ میرے خدا، وہ اپنی دسوں انگلیوں کی طرف ایک ٹک تاک رہی تھی۔ کیا یہ میرے ناخن ہیں؟ ''تم دیکھ رہی ہو؟ جب سات برس کی عمر میں تم یہ گل کھلا سکتی ہو تو آگے کیا کرو گی؟ اسے راہِ راست پر لانا ضروری ہے، منشی جی! میری چابک!''

لمبے شخص کی پاٹ دار آواز رات کے سناٹے کو چیر گئی جس کے ساتھ ہی دھند کی چادر سے ایک بالکل دبلا پتلا شخص نمودار ہوا جو ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی کمر پر جھکا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں کان کافی بڑے، ناک طوطے کی چونچ کی طرح نوکیلی اور سر پر بال خارپشت کے کانٹوں کی طرح کھڑے تھے۔ اس کے پاس ایک لمبی چابک تھی جسے وہ اپنی استخوانی مٹھیوں میں پیش کرنے کے

انداز میں تھامے ہوے تھا۔ اس کا سایہ سڑک پر کسی سانپ کی طرح رینگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

''حضور، اس کے لیے یہ چابک بالکل مناسب رہے گی۔ میں اسے ان شیطانوں پر آزما چکا ہوں۔ اس نے ہمیشہ اپنا کام کیا ہے۔ یہ اس کی جلد میں بچھو کی طرح ڈنک مارے گی۔'' چابک لمبے شخص کو پیش کرنے کے بعد وہ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں مسلنے لگا۔ اس کی آنکھیں کسی بھوکے درندے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ''اور میں نہ کہتا تھا وہ ایک ہنی کٹی لڑکی ہے، اسے بھر پیٹ کھلانا دانشمندی نہیں۔ دیکھیے اس نے کیا گل کھلایا ہے!''

''اسے اس کی سزا ملے گی۔ میز کدھر ہے؟ میز لاؤ!'' بغیر چہرے والے آدمی نے پلٹ کر رات کے سناٹے سے کہا اور اس کی آواز نے فوری طور پر ایک سرنگ کی شکل اختیار کر لی جس سے ایک اسٹریچر اپنے پہیوں پر چرخ چوں کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ اسے ہاف پینٹ اور ہاف شرٹ پہنے ہوے دو اردلی ڈھکیل رہے تھے جن کے سر گردنوں کے اوپر سے غائب تھے۔ انھیں دیکھ کر دورویہ عمارتوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ بہت ساری کھڑکیاں بجھ گئیں جن کی جگہ نئی کھڑکیوں نے لے لی جن میں انسانی اجسام پہلے کی مانند حرکت کر رہے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ قدرت ہر انسان کو یکساں طور پر اذیت پسندی اور تجسس کی ارزانی سے نہیں نوازتا۔ شاید یہ ان نئی کھڑکیوں سے آتی روشنیوں کا اثر تھا کہ سڑک پر سایوں نے اپنے مقام بدل لیے۔ تھوڑی دیر پہلے جہاں اندھیرا تھا وہاں پر روشنی کی لکیریں ناچ رہی تھیں، اور جو حصے روشن تھے اچانک وہ تاریکی میں ضم ہو گئے تھے۔ خود اس کے رخ پر کھڑے کھمبے کا بلب اتنا روشن ہو گیا تھا کہ لوہے کا کھمبا، جو تھوڑی دیر پہلے دھندلی لکیر کی طرح تیر رہا تھا، بالکل صاف دکھائی دینے لگا تھا۔

دونوں اردلی اسٹریچر چھوڑ کر بچی کی طرف لپکے۔ وہ ان کے شکنجوں میں اوپر کی طرف اٹھتی نظر آئی اور کسی ہلکی پھلکی گڑیا کی طرح پیٹ کے بل اسٹریچر پر لٹا دی گئی۔ اس کے ہاتھ پیر اسٹریچر برداروں نے چاروں کھونٹ سختی سے کھینچ رکھے تھے اور، اس کے باوجود کہ ان کے سر کندھوں کے اوپر سے غائب تھے، ان کے جسمانی اضطراب سے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنی نہ نظر آنے والی آنکھوں سے گرسنگی کے ساتھ بچی کے بھرپور کولھوں کی طرف تاک رہے ہیں۔ زخمی شخص کھڑا اپنی آنکھ کے ڈھیلے کو بار بار واپس اس کے گڈھے میں ڈھکیل رہا تھا، مگر وہ ہر بار ابل کر اس کی ہتھیلی پر آ گرتا۔

''میں دنیا کو کیا منھ دکھاؤں گا!'' وہ درد سے بلبلا رہا تھا۔ ''اب میں ایک آنکھ کے ساتھ اپنے

لوگوں کے سامنے کیسے جاؤں گا؟''

''آج کے بعد وہ خواب میں بھی بھاگنے کے بارے میں نہیں سوچے گی!'' لمبے شخص کی چابک تازیانے کی طرح ہوا میں لہرائی اور بچی کی چیخ دونوں طرف کی عمارتوں میں اوپر کی منزلوں تک پھیل گئی۔

2

وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اپنے سامنے پھیلائے اندھیرے میں انھیں گھور رہی تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے چارپائی کے چرچرانے کے ساتھ کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ ایک ہیولا دیوار کی طرف لپکا اور بلب جل اٹھا۔ یہ اس کا شوہر تھا جو پلنگ کے سامنے کھڑا اس کی طرف غور سے تاک رہا تھا۔ پاجامے کے اوپر اس کا بدن ننگا تھا، گھنے بال سر پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوے تھے اور آنکھوں میں کچی نیند کے ساتھ ساتھ رات کی شراب کا خمار قائم تھا۔

''تم نے پھر سے وہ خواب دیکھا ہے؟'' بستر پر بیٹھ کر اس نے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے اور ان کی کپکپاہٹ روکنے کی کوشش کی۔ ''تم پسینے میں نہا گئی ہو۔'' ہاتھ اس کے پیچھے لے جا کر وہ بلاؤز کے اوپر سے اس کی پیٹھ ٹٹولنے لگا۔ ''دیکھو، ہمیشہ کی طرح تمھاری پیٹھ سے خون رس رہا ہے۔''

''نہیں... '' اس کے گلے میں آواز پھنس رہی تھی۔ اس نے اپنی پیٹھ کو شوہر کی گرفت سے آزاد کر کے چادر سے ڈھک لیا۔ ''یقین کرو، یہ ایک دوسرا خواب تھا۔ میں نے دیکھا، میں ایک جنگل میں ہوں اور... ''

''... ایک اجگر اپنا جبڑا کھولے تمھارا پیچھا کر رہا ہے۔ سو جاؤ۔'' اس کا شوہر مایوسی سے گردن کھجاتا ہوا اپنی چارپائی پر واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے بلب بجھا دیا تھا۔ ''تمھیں خواب دیکھنے کی لت ہے، مگر تم کبھی اپنا صحیح خواب مجھے نہیں بتاؤ گی،'' اندھیرے میں اس کی آواز سنائی دی۔ ''اور اس کے لیے میں تمھیں دوش بھی نہیں دوں گا۔ شاید تم عورتوں کے کچھ اپنے راز ہوتے ہیں جنھیں تم قبر تک لے جانے پر مجبور ہو۔''

وہ دیر تک چپ بیٹھی بیٹری سے چلنے والی دیوار گھڑی کی چھک چھک سنتی رہی۔ محلہ سناٹے میں

ڈوبا ہوا تھا۔ گلی کی طرف کھلنے والے دروازے کے تنگ تھڑے پر ایک کتے کا پلّا رات کے آخری پہر کی ٹھنڈ سے کنکیا رہا تھا۔ شاید اسے اپنی ماں کی کوکھ کم پڑ گئی تھی جبکہ ان کے چھوٹے سے دالان پر ہوا کسی ٹین کے کواڑ کو دھیرے دھیرے دیوار پر تھپکی دے رہی تھی۔ اس کا چار سالہ بچہ پلنگ پر دوسری کروٹ سو رہا تھا۔ کوئی اور بچہ ہوتا تو ماں کی چیخ سے کب کا جاگ چکا ہوتا۔ مگر ہمیشہ کی طرح اسے باہر کی دنیا سے کوئی مطلب نہ تھا۔ اسے اپنے شوہر کا خراٹا سنائی دیا۔ کیا بھوکا پیٹ انسان اتنی گہری نیند سو سکتا ہے؟ مگر اس کے شوہر نے غلط نہیں کہا تھا، وہ ہر بار اپنی کہانی بدل دیا کرتی تھی۔ وہ کیا کرے، وہ اسے بدلنے پر مجبور تھی۔ اسے اپنے شوہر کی تجسس میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے ہول آتا تھا۔ وہ واقعہ ایسا نہیں تھا کہ وہ اسے ٹھیک طور پر سمجھ پاتا۔ کون جانے وہ اس کا کیا مطلب نکال لے۔ مگر یہ بھی ہے کہ اب اس کا خواب پہلے کے مقابلے تیزی سے بدلنے لگا تھا، بلکہ اب تو اس سے انسانی چہرے اور سر بھی غائب ہوتے جا رہے تھے، یہاں تک کہ اب اگر وہ یہ خواب اپنے شوہر کو ہو بہو بتا بھی دے تو شاید وہ اس کا کوئی سر پیر نہ نکال پائے۔

اسے اپنی پیٹھ پر گیلے پن کا احساس ہوا۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر طاق سے لال دوا کی شیشی اور روئی اتاری جسے وہ ہمیشہ وہاں رکھا کرتی تھی اور بلاؤز اور برا کھول کر پیٹھ پر دوا لگانے لگی۔ تھوڑی دیر کے لیے کسی وجہ سے اس کے شوہر کا خراٹا بند ہو گیا تھا اور باہر تھڑے سے پلّے کی کوں کوں بھی غائب ہو گئی تھی۔ اس کا شوہر تکیہ پر سر رکھتے ہی سو جانے کا عادی تھا، ایسی نیند جو صرف دو طرح کے لوگوں کو آسکتی ہے، ایک وہ جنھیں اپنے سوا کسی کی پروا نہیں ہوتی، دوسرے وہ جن کا ضمیر بالکل صاف ہو، اور اس کے شوہر کے اندر یہ دونوں خصوصیات موجود تھیں۔ شیشی اور روئی پلنگ کے نیچے رکھ کر بلاؤز اور برا پہنے بغیر ہی اس نے چادر سے اپنی پیٹھ ڈھک لی اور بچے کی طرف کروٹ لے کر اس کے منحنی سر کو سہلانے لگی۔ دوا جیسے جیسے اس کی پیٹھ پر سوکھ رہی تھی، جلد پر چیونٹیوں کے خاردار پیر رینگ رہے تھے۔ وہ دیر تک اسی حالت میں بے حس و حرکت پڑی سیلنگ کی طرف تاکتی رہی جہاں کھپریل کے سوراخوں میں چاند کی کرنیں جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں یہاں تک کہ اس کی پیٹھ پر چیونٹیوں نے رینگنا بند کر دیا۔

3

صبح ہو چکی تھی۔ اندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے برآمدے کا کنارہ، اس سے لگا آنگن اور اینٹ

کی بغیر پلستر کی دیوار نظر آ رہی تھی۔ اس کی نیند چھوٹے بچے کی آواز سے کھلی تھی جو زنگا تار کھانسے جا رہا تھا۔ اس نے اپنی بوجھل آنکھوں سے بچے کی طرف دیکھا جو بستر پر بیٹھا ابنی چوزوں کی طرح زرد اور رقیق آنکھوں سے اسی کی طرف تاک رہا تھا۔ اس کے لاغر بازوؤں اور رسی کی طرح پتلی گردن سے ان گنت تعویذ اور گنڈے بندھے ہوئے تھے یا لٹک رہے تھے، جن میں سے زیادہ تر تعویذوں پر نہ صرف بچے کے دانتوں کے نشان تھے اور ان کے موم باہر نکل آئے تھے بلکہ بچے کی رال کے سبب وہ دائمی طور پر گیلے رہا کرتے تھے۔ اسے کالی کھانسی اور لال بخار سے لے کر خسرہ تک سارا سال کوئی نہ کوئی بیماری گھیرے رہتی۔ کیا وہ اپنے بڑے بھائیوں کے برعکس، جو گھر پر ہمیشہ اُدھم مچاتے رہتے، ساری زندگی ایک چپ انسان بنا رہے گا، اپنی بے جان آنکھوں سے ایک محفوظ فاصلے پر بیٹھا دنیا کی طرف لاتعلقی سے تاکتا رہے گا؟ اسے اپنے ننگے پن کا احساس ہوا اور وہ برا اور بلاؤز پہننے لگی۔ لنگوروں کا ایک باؤلا جھنڈ دالان کی نیم چھت کو دہلاتے ہوئے گزرا اور بچہ خوف کے مارے ماں سے لپٹ گیا۔ دلاسا دینے کے لیے وہ اس کا سر اپنی چھاتی سے لگائے دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کے باوجود کہ رات اس نے نیند کی حالت میں اس کی چڈی بدل دی تھی، اس کے جسم سے پیشاب کی بو آ رہی تھی۔ اس نے پھر سے اس کے کپڑے بدلے اور منھ دھلانے آنگن میں لے گئی جہاں امرود کا اکلوتا پیڑ شبنم سے ڈھکا کھڑا تھا۔ کچھ پکے ہوئے امرود، جن کے چھلکے سلامت تھے مگر اندر کے گودے چمگادڑ پوری طرح کھا چکے تھے، مٹی پر پڑے پڑے انسانی پیروں کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کا شوہر اپنے بستر پر نہیں تھا۔ ہر اُس آدمی کی طرح جسے نیند آنے میں پریشانی نہیں ہوتی، وہ گھر پر سب سے پہلے ٹیلے والی مسجد سے آتی اذان کے ساتھ جاگ جایا کرتا۔ اس وقت وہ چوراہے پر بنے سرکاری کنویں کے صحن پر بیٹھا دانتوں پر برش کرتے ہوئے شہر کی طرف تاک رہا ہوگا۔ اس کے دونوں بڑے لڑکے ابھی تک سو رہے تھے۔ وہ کبھی خود سے نہیں جاگتے تھے مگر اس نے آج انھیں اسکول کے لیے جگانے کی کوشش نہیں کی۔ اندر کے برآمدے میں دونوں پالتو بلیاں، پنجے جسم کے اندر چھپائے، اپنی آنکھوں کے کنجوں سے دن کو صاف ہوتے دیکھ رہی تھی۔ کئی برس پہلے ایک بلی نے کہیں سے آ کر ان کے آنگن میں اپنی گرہستی بسائی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے گھر پر بلیوں کی اچھی خاصی تعداد ہو گئی تھی جو دالان سے لے کر چھپروں کے اوپر تک منڈلایا کرتیں۔ پھر بلیاں ایک ایک کر کے غائب ہونے لگیں۔ کچھ بلیوں کو اس کا شوہر اسے اطلاع دیے بغیر شہر کے مچھلی بازار میں چھوڑ آیا۔ اب بھی

دو بلیاں رہ گئی تھیں جو جڑواں بہنیں تھیں اور ہمیشہ ایک ساتھ نظر آتی تھیں۔ اس وقت بھی جب گھر پر بلیوں کی اچھی خاصی تعداد ہو گئی تھی، وہ اپنی تمام بلیوں کو ٹھیک طرح سے پہچانتی تھی سوائے ان بلّوں کے جن کے نطفوں سے وہ پیدا ہوئی تھیں۔ اکثر وہ حیران ہو کر سوچا کرتی کہ انسانوں کے برعکس ان جانوروں کے رشتے آپس میں کتنے الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر اب یہ دو بلیاں ہی بچ گئی تھیں۔ ان کی پسلیاں سینے سے لگی ہوئی تھیں جن کی طرف تاکتے ہوئے اسے شدید ندامت کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا پچھلے کئی سالوں میں کبھی کوئی ایسا ہفتہ گزرا ہوگا جب کسی نہ کسی دن ان کا چولھا ٹھنڈا نہ پڑا ہو اور یہ تو ان کی فاقہ کشی کا تیسرا دن تھا۔ انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنے ساتھ ساتھ ان جانوروں کو بھوکا رکھیں۔ شاید اس کا شوہر غلط نہ تھا جب وہ اس کی مرضی کے خلاف بلیوں کو مچھلی بازار میں چھوڑ آتا۔ مگر بلیاں تو اپنی خوراک ڈھونڈنے پر قادر ہوتی ہیں، اور غریبوں کے محلوں میں کھانے کی چیزوں کی کون سی کمی ہوتی ہے، اور پھر انھیں شہر میں جانے سے کون روک سکتا ہے جہاں ہر طرف کچرے کے ڈھیروں پر مکھیاں بجبجایا کرتی ہیں، صرف تمھاری ناک صحیح جگہ پر ہونی چاہیے۔ اس نے بلیوں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے بتانا چاہتی ہو کہ آج بھی چولھا ٹھنڈا رہنا ہے اور انھیں خود اپنی خوراک کا انتظام کر لینا چاہیے۔ شاید بلیوں نے اس کی بات کو سمجھ لیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئیں اور لپک کر مرغی کے دڑبے کے اوپر رکھی اُپلوں کی ٹوکریوں کے سہارے دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئیں۔ پلاسٹک کے ڈرم سے پانی نکال کر منھ دھوتے وقت اس نے دیوار پر بیٹھے دونوں کوّوں کی طرف دیکھا جو سفید آسمان کے نیچے، جس پر ابھی سورج کی روشنی آئی نہ تھی، بالکل نیلے نظر آ رہے تھے جبکہ ان کا فطری رنگ کالا تھا۔ خدا کی اس مخلوق کو وہ کبھی سمجھ نہیں پائی تھی جنھیں گرمی سردی یا برسات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کیا انھیں ہم انسانوں کی طرح کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے؟ تو پھر وہ بلاوجہ اپنی قائیں قائیں کیوں کرتے رہتے ہیں؟

باہر تالاب سے بطخوں کے کنکنانے کی آواز ابھری اور کوئی آدمی راکھ پر چلتے ہوئے کھانسنے لگا۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی کسی عورت کو خبردار کر رہا ہوگا۔

وضو کر کے اس نے فجر کی نماز پڑھی اور شال کندھے پر لپیٹ کر کوثر کے گھر کی طرف چل دی، جو اس کے پڑوس میں رہا کرتی تھی۔ اس کے دو گھر بعد کوثر کا پشتینی گھر تھا۔ وہ اس کے ساتھ اپنا دکھ درد بانٹنے کی عادی تھی۔ آسمان پر سپیدی پھیلنے لگی تھی جس کے نیچے محلے کے گھروں کی دیواریں اور چھپر اُس

وقت کے مقابلے زیادہ صاف نظر آ رہے تھے جب سورج آسمان پر چمک اٹھتا ہے۔ کوثر برآمدے پر بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

''جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا تھا کوثر، میں کام کی تلاش میں جا رہی ہوں،'' اس نے چارپائی کے سامنے رکھے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مونڈھے کی سیٹ دھنسی ہوئی تھی مگر اب اسے اس کی عادت پڑ چکی تھی۔ ''کیا تم میرے بچوں پر نظر رکھوگی؟ کچھ ہی گھنٹوں کی بات ہے۔''

''تم نویں پاس ہو۔ پھر بھی کون سا کام کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہو؟''

''جھاڑو پوچھا یا چولھا چوکا کرنے کے علاوہ مجھے کوئی کام ملنے سے رہا۔ ویسے بھی مجھے اور کوئی کام آتا بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، بچوں کی طرف سے اطمینان رکھو۔ بس مجھے تمھارے آدمی سے تھوڑا ڈر لگتا ہے،'' کوثر نے ہمیشہ کی طرح بے باکی سے اپنی بات رکھی تھی۔ ''کیا اس نے کام کرنا بالکل بند کر دیا ہے؟ تو سوال اٹھتا ہے، تم کب تک اس طرح گھر چلاؤ گی؟''

وہ خاموش رہی۔ اپنے شوہر کے سلسلے میں اس طرح کے سوالوں کا اسے اکثر سامنا کرنا پڑتا تھا مگر ان کا اس کے پاس نہ کل کوئی جواب تھا نہ آج ہے۔ وہ طاق پر رکھے رحل کی طرف تاک رہی تھی جس پر قرآن شریف جزدان سے لپٹا رکھا تھا اور ایک بجھی ہوئی موم بتی جانے کب سے اپنے موم میں گتھی ہوئی دھول کھا رہی تھی۔ اس کا دھول سے اٹا ہوا فلیتہ کسی چوہیا کی دم کی طرح مردہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے کبھی کوثر کو جزدان کھولتے نہیں دیکھا تھا۔ ہر جمعے کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرنے ایک مولانا آتے تھے جنھیں کوثر دوپہر کا کھانا کھلانے کے بعد چراغی کے طور پر پانچ روپے دیا کرتی تھی۔ اِدھر جب سے کوثر کا شوہر جدہ گیا ہوا تھا، دونوں آپس میں کافی گھل مل گئی تھیں۔ کوثر اس کی طرف ایک ٹک تاک رہی تھی جیسے اپنے سلسلے میں اس کے خیالات کو پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو، جب ٹیلے والی مسجد کا لاؤڈ اسپیکر کڑکڑایا اور ایک آدمی کے انتقال کی خبر نشر ہونے لگی۔ اتنے فاصلے پر انھیں صرف آواز ہی سنائی دیتی تھی، الفاظ ہمیشہ آپس میں گڈمڈ ہو جایا کرتے۔

''یہ ہماری فاقہ کشی کا تیسرا دن ہے،'' خبر ختم ہونے پر اس نے اپنا حلق صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں تو پتا ہے میرے سارے گہنے پاتے بک چکے ہیں۔'' وہ اپنی ننگی کلائیوں کی طرف دیکھ

رہی تھی جن میں کانچ اور پلاسٹک کی چند مرگھلی چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ''اگر میں نے کام نہ ڈھونڈا تو ہم بھوکوں مرجائیں گے۔'' اعلان ختم ہونے پر وہ سردمہری سے فرش کی طرف تاکنے لگی جیسے اپنی ساری مصیبت کا الزام کسی طور فرش پر عائد کرنا چاہتی ہو۔

''تمھیں کسی گھر کا پتا بھی ہے کہ یوں ہی کام کی تلاش میں نکل رہی ہو؟''

''مجھے ایک گھر کا پتا ہے جہاں مجھے کام مل سکتا ہے۔ میں سالوں سے پرانے بازار کی طرف جاتے وقت اس گھر کو دیکھتی آرہی ہوں کیونکہ اسے دیکھ کر مجھے اپنے باپ کا گھر یاد آجاتا ہے۔ مجھے خبر ملی ہے کہ وہاں پر کام والی نے آنا چھوڑ دیا ہے۔''

کوثر نے ترحم آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا، چارپائی سے اتر کر باورچی خانے کے اندر گئی اور چار روٹیاں ایک پتیلے میں ڈھک کر لے آئی۔ ''رات کی باسی روٹیاں ہیں، گرم کرلینا۔ میرے پاس بس یہی بچی ہیں۔''

''رہنے دو۔ پچھلے دو دن سے تم میری مدد کررہی ہو، آج میں کوئی نہ کوئی انتظام کرلوں گی۔'' وہ کوثر سے نظر ملا نہیں پا رہی تھی۔ ''مجھے بہت پہلے اس کے بارے میں سوچ لینا چاہیے تھا۔''

''شہر میں کام تو ہے، مگر کام مانگنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ تم اپنے باپ کے گھر مدد مانگنے کیوں نہیں جاتیں؟''

''مجھے وہاں گئے دو سال ہوگئے ہیں۔ انھوں نے خود سے کبھی کوئی خبر نہیں لی۔ مجھے نہیں لگتا اب وہ لوگ مجھے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ پچھلی بار انھوں نے کوئی خاص مدد نہیں کی تھی۔''

''پھر تو تمھارا فیصلہ صحیح ہے،'' کوثر چارپائی پر بیٹھتے ہوئی بولی۔ ''روٹی لے جاؤ۔ یہ میں نے تم لوگوں کے لیے ہی بچا کر رکھی تھی۔ میں رات کو ہی پہنچا دیتی مگر مجھے تمھارے شوہر سے ڈر لگتا ہے۔ وہ جب نشے میں ہوتا ہے تو اسے اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔''

وہ کب نشے کے بغیر گھر لوٹتا ہے؟ اس نے آہ بھر کر شکایت بھری نظروں سے کوثر کی طرف دیکھا۔ کیا پھر بھی کوثر کا یہ یاد دلانا ضروری تھا؟

وہ واپس لوٹی تو اس کا شوہر اپنے بستر پر واپس آچکا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے کمبل کو بھنوؤں تک کھینچ لیا۔ وہ کپڑے بدل کر آنگن میں آئی جہاں اس کے دونوں جڑواں لڑکے کیمپس کی پرانی داغدار

گیند سے جس کے روئیں اکھڑ چکے تھے، دیوار پر نشانہ لگا رہے تھے۔ انھوں نے چہرہ تک نہیں دھویا تھا۔ ان کے منھ کے کونوں پر رال کی سفید پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ چھوٹا بچہ برآمدے کی سیڑھی پر چپ بیٹھا ان کی طرف تاک رہا تھا۔ دیوار سے دونوں نیلے کوے اڑ چکے تھے۔ ایک کمسن کوا اُپلوں پر کھڑا اپنی چونچ سے ٹھونگیں مار مار کر اندر کے دانے نکالنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ چڑیاں، ان کا کبھی ایک ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے وہ خوش رہتی ہیں، چہچہاتی رہتی ہیں، تائیں تائیں کرتی رہتی ہیں۔

''میں نے روٹی اور چائے باورچی خانے میں رکھ دی ہے۔ ہاتھ منھ دھو کر چولھے پر گرم کرلینا اور پھر اس کی راکھ گرا دینا۔'' اس نے لڑکوں کا کھیل روکنے کی کوشش کی مگر وہ اس سے تھوڑا ہٹ کر پھر سے دیوار پر گیند پھینکنے لگے۔ آخرکار صالحہ کو انھیں ان کے کالر سے پکڑ کر روکنا پڑا۔ ''تم لوگ میری بات سنتے کیوں نہیں؟ تمھارے چھوٹے بھائی کو میں کھلا چکی ہوں۔ میرے لوٹنے تک گھر پر ہی رہنا اور ابو کے چلے جانے کے بعد دونوں طرف کے دروازے ٹھیک طرح سے بند کرلینا۔ ڈر لگے تو بھائی کو لے کر کوثر خالہ کے گھر چلے جانا۔''

اس کا گھر گلی کے اندر ہوتے ہوئے بھی نکڑ بس پچاس قدم کی دوری پر تھا اور دالان سے چوراہے کا ایک حصہ نظر آیا کرتا۔ یہ چوراہا اس مقام پر آخری اونچی جگہ تھی جس کے بعد زمین ڈھال کی شکل میں کئی فرلانگ چل کر شہر کی طرف چلی گئی تھی جس کے گھر یہاں سے کھلونوں کی طرح نظر آیا کرتے۔ شہر ندی کے دونوں کنارے پھیلا ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت چوراہے سے لگے سرکاری کنویں پر لوگوں کی بھیڑ تھی۔ کل تک کنویں سے پانی نکالنے کے لیے لوگوں کو اپنے ڈول اور رسیاں لانی پڑتی تھیں مگر جب سے اس کے صحن پر ایک سرکاری نل لگا دیا گیا تھا، اس پر صبح شام پانی آیا کرتا۔ اب لوگوں کو کنویں سے پانی نکالنے کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی۔ ویسے بھی یہ کنواں برسوں سے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ کبھی جس کنویں کے پانی سے دال تک گل جاتی تھی اب لوگ اس کا پانی صرف کپڑے دھونے کے لیے استعمال کرتے تھے، یا شاید وہ بھی نہیں کرتے تھے۔ اپنی چرمی تھیلی بغل سے لٹکائے چوراہے سے گزرتے وقت اس نے مڑ کر محلے کے چھپروں کی طرف دیکھا جن کا سلسلہ کھڑی چٹانوں والے ٹیلے پر جاکر ختم ہوتا تھا۔ وہاں پر تاڑ اور کھجور کے درختوں کا جھنڈ تھا جن کے درمیان سے مسجد کے سبز میناروں کے اوپری سرے نظر آیا کرتے۔ اس جگہ درختوں پر گدھ بیٹھے پہرہ دیا کرتے۔ ان مردار خوروں کے

چونچ گھسنے کے سبب تاڑ کے درختوں کی پھننگیں ننگی ہوگئی تھیں جن سے نکلے ہوئے کھونچ ڈوبتے سورج کے سرخ گولے پر نشتر لگایا کرتے۔ ان درختوں کی طرف تاکتے ہوئے اسے ہر بار ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ لوگ ان مردار خوروں کے سائے میں جی رہے ہوں۔ شاید یہ ان منحوس پرندوں کا اثر ہے کہ میں نے آج تک یہاں پر کسی انسان کو اندر سے مسکراتے نہیں دیکھا ہے۔ ٹیلے کے دوسری طرف سے ایک نہر گزرتی تھی جس کے کنارے لاریاں چلا کرتیں۔ نہر پار ریل کی پٹریاں تھیں جہاں سے گزرتی ٹرینوں کی سیٹی آدھی رات کے وقت آسمان سے اترتی ہوئی محسوس ہوتی۔ لاک گیٹ زیادہ تر وقت بند رہنے کے سبب نہر کا پانی ہرا پڑ گیا تھا۔

وہ ڈھال پر دیر تک چلتی رہی، یہاں تک کہ شہر کے مکانات شروع ہوگئے اور پکے گھروں کے درمیان وہ ایک کھلونے کے مانند نظر آنے لگی۔ کنویں کے صحن پر دو شخص بیٹھے ہوئے اسی کی طرف تاک رہے تھے۔ ایک شخص نے جو دانتوں پر دتون رگڑ رہا تھا اور ہمیشہ اس کے گھر کے آس پاس منڈلایا کرتا، دتون سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کا نام صالحہ ہے۔ محلے میں سب سے اونچا مکان اسی کا ہے مگر وہ ایک دکھی عورت ہے۔ یوں تو اس کے تین بہت پیارے بچے ہیں مگر میں ایسی کوئی رات نہیں دیکھتا جب اس کا شوہر شراب پی کر گھر نہ لوٹتا ہو۔''

''ایسا شوہر نصیب میں لکھا کر لانا پڑتا ہے،'' اس کے ساتھی نے کہا جو نل پر اپنا منھ دھو چکا تھا اور کُرتے کے دامن سے چہرہ صاف کر رہا تھا۔ ''اور تمھیں ہی سارے محلے کی خبر کیوں رہتی ہے؟''

''کیا یہ کوئی گناہ ہے؟'' دتون منھ سے نکال کر باتونی شخص نے کہا۔ ''میں اسے اُن دنوں سے دیکھ رہا ہوں جب سے وہ یہاں پر آئی ہے۔ وہ اچھے گھرانے کی لڑکی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا وہ اس محلے تک کیسے پہنچی۔''

4

صالحہ!

یہ نام ایک یتیم خانے کا دیا ہوا تھا جہاں اس نے اپنی زندگی کے شروع کے سات سال گزارے

تھے۔ یہ ایک بہت ہی پرانا یتیم خانہ تھا جو ایک بڑے شہر کے قدیم علاقے میں واقع تھا۔ وہ ایک دن کی تھی جب اس کے پھاٹک پر اس کی ماں آدھی رات کے سناٹے میں اسے چھوڑ گئی تھی، جس کے دوسرے مہینے پھر سے نمودار ہو کر اس نے اپنی بیٹی پر دعویٰ دائر کر دیا تھا۔ اُس وقت وہ تقریباً ننگی تھی، اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں ایک جنونی کیفیت طاری تھی جنھیں دیکھ کر یتیم خانے کے منتظمین نے پولیس کو بلا لیا۔ تب سے وہ ہر دو تین مہینے میں یتیم خانے کے پھاٹک پر نمودار ہونے لگی تھی۔ جب تک صالحہ وہاں رہی، اس نے یتیم خانے کی انتظامیہ کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ بعد کے سات سال اسے اس شہر سے دور اپنے رضاعی والدین کے گھر رہنا پڑا جن کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ وہ لوگ کھیتوں اور سال کے جنگلوں سے گھرے ہوئے ایک قصبے میں رہتے تھے۔ پہلے کے دو سال اس کی ماں غائب رہی، شاید اس کا کھوج لگانے میں اسے اتنا وقت لگ گیا تھا۔ صالحہ اسے تقریباً بھول چکی تھی جب وہ پھر سے اپنے ٹیڑھے میڑھے بے ہنگم دانتوں کے ساتھ نمودار ہوگئی۔ یہ قصبہ ایک قومی شاہراہ سے لگا ہوا تھا جس پر قصبے کی واحد پکی سڑک جا کر ملتی تھی۔ شروع میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلا مگر پھر لگاتار اس کے رضاعی والدین کے بچے ہوتے چلے گئے اور صالحہ گھر میں ایک اضافی چیز بن کر رہ گئی جس سے منھ بولی ماں کے علاوہ گھر کے سب لوگ آنکھیں چرانے لگے تھے۔ اس نے ابھی نویں کا امتحان پاس ہی کیا تھا جب اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک غریب گھرانے کا لڑکا ڈھونڈ لیا گیا جس نے بارھویں تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ایک گورا چٹا جوان تھا جو سرکاری نوکری کے لیے پوری سرگرمی سے لگا ہوا تھا۔ اسے شادی کی جلدی نہ تھی، مگر صالحہ کا منھ بولا باپ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا یا شاید اسے خود صالحہ سے پیچھا چھڑانے کی جلدی تھی۔ اس کی منھ بولی ماں چاہتی تھی کہ وہ کم از کم میٹرک کا امتحان پاس کر لے جس کی پوری تیاری پردے میں رہنے کے باوجود وہ گھر میں ہی بیٹھے بیٹھے کر چکی تھی، مگر امتحان سے پہلے ہی اس کی شادی کر دی گئی۔ بعد میں اس کی پوری دنیا بدل گئی۔ قصبے کا واحد اسکول اب اسے اپنے کسی پچھلے جنم کی بات لگتی تھی جہاں وہ اپنی ساری سہیلیاں چھوڑ آئی تھی۔ اپنے کسی احساسِ جرم کے تحت اس کے رضاعی والدین نے نہ صرف جہیز کے طور پر دوسرے ضروری ساز و سامان کے ساتھ اپنے قصبے سے دور اس چھوٹے سے شہر میں ایک دالان اور آنگن والا کھپریل کا گھر دیا تھا، جو زیادہ سے زیادہ ایک دیہاتی نما دو چالہ مکان کہا جا سکتا تھا، بلکہ شروع کے کچھ سال انھوں نے دونوں کی مالی کفالت بھی کی۔ مگر لڑکا سرکاری نوکری کے سلسلے میں

بدنصیب ثابت ہوا۔ دس برس بیت گئے، ان کے تین بچے بھی ہو گئے، مگر اسے کوئی سرکاری نوکری نہیں ملی۔ اس چھوٹے سے شہر میں ایسی کوئی پرائیویٹ کمپنی بھی نہیں تھی جہاں اسے نوکری مل سکے۔ مایوس ہو کر اس نے لکڑی پٹی میں خراد کا کام سیکھنا شروع کر دیا جہاں اس کا باپ مرنے سے پہلے بڑھئی کا کام کیا کرتا تھا۔ وہ لوگ کھپریل کے جس گھر میں رہتے تھے وہ غریبوں کے محلے میں واقع تھا جہاں دور تک ٹیڑھی میڑھی افسردہ جھونپڑیاں کھڑی تھیں یا ٹین اور دفتی کے گھر بنے ہوئے تھے۔ ان گھروں کے درمیان صالحہ کا مکان اپنے چھوٹے سے دالان گھر اور پشت کی دیوار پر اگے طفیلی پودوں کی وجہ سے، جن میں سے کئی تناور درخت بن گئے تھے، دوسرے گھروں کے مقابلے اونچا نظر آتا۔ صالحہ کے پاس گھر کے کاغذات نہیں تھے، نہ ہی شادی کے وقت وہ ان چیزوں کو جانتی تھی۔ شاید اس کے رضاعی والدین نے اس مکان کے سلسلے میں کوئی آخری فیصلہ نہیں کیا تھا یا پھر انھیں اپنے داماد پر بھروسا نہیں تھا جس نے ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ خود بھی کوئی سرکاری نوکری نہ ملنے کے سبب شدید مایوسی کا شکار تھا اور اِدھر جب سے خراد کے کام سے پیسہ آنے لگا تھا، بری سنگت میں پڑ کر نہ صرف اس نے جوے کی لت لگا لی تھی بلکہ وہ نشے میں دھت گھر بھی لوٹنے لگا تھا۔ اس طرح صالحہ کے اوپر دوہری ذمے داری آن پڑی تھی۔ اسے اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ اپنے شوہر کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا جس کی تلاش میں کبھی کبھار دیر رات کو اسے گھر سے نکلنا پڑتا یہاں تک کہ کئی بار اسے مقامی تھانے کا رخ بھی کرنا پڑا۔ اپنے ذاتی تجربے سے اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اتنا برا انسان نہیں تھا جتنا ساری دنیا اسے سمجھتی تھی۔ صرف صالحہ کو یہ دیکھ کر بڑی تکلیف پہنچتی کہ نشے میں اسے اچھے برے کی تمیز نہ ہوتی اور وہ نہ صرف بلا وجہ لوگوں کے ساتھ جھگڑے فساد پر اتر آتا بلکہ کسی ان پڑھ جاہل کی طرح گالی گلوج سے بھی باز نہ آتا۔ مگر اس کے مخاطب دراصل وہ لوگ ہوتے جنھوں نے ایک جھونپڑی کا جھانسا دے کر اسے اس آلسی شہر میں لا کر پریوار کے جھمیلے میں ڈال دیا تھا اور برے وقت میں اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس کی دھمکیاں پاس پڑوس کے تمام لوگ سنا کرتے مگر یہ پتا چلانا مشکل تھا کہ وہ یہ دھمکیاں کسے دے رہا ہے؟ لوگوں نے اسے کبھی اپنی عورت پر ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا تھا۔ شراب اس کی واحد بری عادت تھی ورنہ باقی وقتوں میں تو وہ اپنی بیوی کا انتہائی فرمانبردار اور مطیع انسان تھا۔ یہی نہیں، اِدھر کچھ سالوں سے وہ خراد کے ایک ماہر مستری کے طور پر بھی جانا جانے لگا تھا جو دن کے خاتمے پر جو بھی پیسہ ملتا سیدھے گھر لاتا اور اپنی بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتا، میرا

مطلب ہے وہ پیسہ جو شراب پینے اور جوے میں ہارنے کے بعد اس کے پاس بچ جایا کرتا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ شراب اور جوے کے بعد لوگوں کے پاس کم ہی پیسے بچتے ہیں۔ یہ ان نامساعد حالات کا نتیجہ تھا کہ صالحہ تینوں بچوں کو دنیا میں لاتے لاتے جہاں کسی سہارے کی عدم موجودگی میں ایک طرف ایک مضبوط ارادوں والی عورت بن گئی تھی جو برے سے برے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتی، وہیں دوسری طرف اسے ہر وقت بے یقینی کی پرچھائیاں گھیرے رہتیں۔ مگر یہ اس کی شخصیت کا وہ رخ تھا جس کا پتا بہت کم لوگوں کو تھا، شاید اس لیے کہ وہ بال بچوں میں گھری ہوئی ایک گھریلو عورت تھی جسے ہم سماجی جانور ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں، یعنی وہ ہمیں نظر ہی نہیں آتی جب تک وہ اپنے گھر کی چہار دیواری سے باہر نہ نکل آئی ہو۔

اور آج وہ روزی روٹی کی تلاش میں گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل آئی تھی۔

5

اپنی زندگی میں صالحہ پہلی بار کام کی تلاش میں نکلی تھی، شاید اسی لیے اور دنوں کے مقابلے سڑک پر چلتے ہوئے اسے چاروں طرف کی دنیا بالکل نئی لگ رہی تھی۔ یہ شہر جس کے نواح میں ان لوگوں کی بستی تھی، کل تک، جیسا کہ اس کا شوہر کہا کرتا، واقعی ایک آلسی شہر تھا جہاں لوگوں کے پاس کرنے کے لیے بہت زیادہ کچھ نہ تھا اور وہ اپنی پرانی قدروں کے ساتھ جی رہے تھے۔ آج بھی شہر کے پرانے علاقے میں بجلی کے کھمبے لوہے کے تھے جن پر سورج ڈوبنے پر یرقان زدہ بلب اپنے سفید ڈھکنوں کے نیچے جلا کرتے، مگر اب اس کے اسٹیشن سے گزرنے والی ٹرینوں کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی کیونکہ اِدھر کچھ برس سے یہاں کی دنیا کافی بدل چکی تھی۔ اس کے باشندوں نے پیسے کی تلاش میں نہ صرف بڑے شہروں کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا بلکہ بدیس تک جانے لگے تھے جس سے یہاں پر نہ صرف ایک طرح کی خوشحالی آ گئی تھی بلکہ دریا کے دونوں طرف کے کھیتوں اور میدانوں میں کثیر منزلہ عمارتوں اور دیدہ زیب کوٹھیوں اور بنگلوں کا جنگل سا اگ آیا تھا۔ کل تک جن تالابوں میں کنول کھلا کرتے تھے، جن بگانوں میں کوئل کوک لگایا کرتی، بانس کے جو جھنڈ ہوا میں سرسرایا کرتے اور جن جنگلوں سے جاڑے کی راتوں میں سیار کی آوازیں آیا کرتیں، آج ان کی جگہ پکی عمارتوں اور دیدہ زیب گھروں نے لے لی تھی۔ ہر طرف

دکانیں اور ہوٹل کھل گئے تھے، سڑک پر موٹر سائیکلیں اور گاڑیاں دوڑنے لگی تھیں اور ہر طرف انسانوں کا ہجوم نظر آنے لگا تھا۔ نئے علاقوں میں جہاں گلی کوچوں کا سیلاب سا آ گیا تھا، زمین اور نالے اب بھی کچے تھے جس کے سبب برسات کے آتے ہی وہ دشوار گزار دلدلوں میں بدل جاتے۔ صالحہ نے ان نئے گھروں سے احتراز کیا تھا کیونکہ یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ وہ جس سڑک پر چل رہی تھی وہ دھیرے دھیرے تنگ ہوتی ہوئی شہر کے پرانے علاقے میں پہنچتی تھی جسے ندی کا کنارہ بھی کہا جا سکتا تھا۔ شاید یہی وہ جگہ تھی جہاں سے دورِ ماضی میں اس شہر کی شروعات ہوئی ہوگی۔ آسمان پر سورج کی کرنیں پھیلنے لگی تھیں جب اس کے پیر اس قدیم دومنزلہ مکان کے ڈھلائی لوہے کے پھاٹک کے سامنے تھم گئے جہاں سے گزرتے وقت ہمیشہ اس کے قدم دھیمے ہو جایا کرتے۔ گھر کی چہار دیواری کے باہر کائی سے ڈھکا ایک تالاب تھا جس کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور پھاٹک سے لگی زمین پر مورچہ کھائی ہوئی رکشا گاڑیاں قطار سے ایک دوسرے سے لگی کھڑی تھیں۔ مسجد کی نیچی چہار دیواری دو تہائی پانی میں ڈوبی رہنے کے سبب مسجد کا کھلا صحن اور ستون نظر آیا کرتے۔ یہ مسجد ہمیشہ اسے اپنے رضاعی والدین کے گھر کی یاد دلایا کرتی جہاں تالاب کے کنارے ان لوگوں کی اسی طرح کی ایک ذاتی مسجد تھی۔ مگر آج اس گھر تک آنے کا مقصد پرانے دنوں کی یاد تازہ کرنا نہیں تھا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ یہاں کے لوگ بھی اس کے رضاعی والدین کی طرح خوشحال ہوں گے اور انھیں ہر طرح کے لوگوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہوگی۔

پھاٹک کھلا ہوا تھا اور اس کے باہر ایک ادھیڑ عمر کا دربان، جس کے بال پیشانی پر گرے ہوئے تھے اور ٹھوڑی پر اگی ہوئی کھچڑی داڑھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی، ایک بغیر کالر والا چرمی جیکٹ پہنے، لوہے کے اسٹول پر بیٹھا ایک میلے کچیلے بلے کو رات کا باسی سالن کھلا رہا تھا۔

''یہاں کوئی روٹی ووٹی نہیں ہے،'' اس نے سالن کا کٹورا بلی کے سامنے رکھتے ہوئے صالحہ کی طرف بیزاری سے دیکھا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کی داہنی آنکھ جو بائیں آنکھ کے مقابلے کافی بڑی تھی، اور بھی بڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھ میں ایک ایسی حیرت نظر آ رہی تھی جیسے اس نے اپنے سامنے کسی سائے کو دیکھ لیا ہو۔ ''میرے خدا!'' وہ اپنا سر کھجانے لگا۔ ''بی بی کون ہو تم؟ کیا ہم پہلے ایک دوسرے سے مل چکے ہیں؟ اور تمھیں اس گھر کا پتا کس نے دیا؟''

''دو ہفتہ پہلے میں یہاں سے اپنے کام سے گزر رہی تھی جب ایک عورت نے مجھے یہ بات بتائی۔

وہ اسی گھر سے نکل رہی تھی اور بہت گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مگر اس وقت مجھے کام کی تلاش نہیں تھی۔''

''مجھے یقین نہیں ہوتا۔'' دربان نے سر کو پھر سے کھجایا۔ اب وہ اس کی آنکھوں سے گریز کر رہا تھا۔ ''جس نے بھی تم سے یہ بات کہی ہے میں نہیں جانتا اس کا ارادہ کیا تھا، مگر میرا دل کہتا ہے اس نے یہ بات اچھی نیت سے نہیں کہی ہوگی۔ تمھیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ دیکھو، میرا دل کتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔''

''وہ کیوں؟'' صالحہ دربان کی طرف حیرت سے تاک رہی تھی۔

''میں بتا نہیں سکتا۔'' وہ بے چینی کے عالم میں اپنے جیکٹ کا بٹن بری طرح مروڑ رہا تھا۔ جیکٹ پرانا مگر کافی قیمتی تھا، اس کے استر پھٹے ہوئے تھے جس سے صاف لگ رہا تھا کہ گھر کے مالک نے پہننے کے لیے اسے دے دیا ہوگا۔ ''مگر خیر اب جب تم آ ہی گئی ہو تو مالکن سے مل لو۔ اسے ایک نوکرانی کی تلاش ہے جو گھر کی صفائی کے ساتھ ساتھ چولھا چوکا سنبھال سکے۔ پچھلی نوکرانی نے بغیر کچھ کہے کام پر آنا چھوڑ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ وہی عورت ہو جس کے بارے میں تم بتا رہی ہو۔ مگر ٹھہرو، کیا تمھیں بلی سے ڈر لگتا ہے؟''

''میں کیوں بلی سے ڈرنے لگی۔'' صالحہ اکڑوں بیٹھ کر بلے کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ بلے کی ریڑھ کی ہڈیوں نے اس کی انگلیوں کے لمس سے اوپر اٹھ کر محراب کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس نے اپنے جسم کو آخری حد تک پھیلا لیا تھا۔ وہ بہت بدمزاج نظر آ رہا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی دم کھڑی کر کے لکڑی کی طرح سخت کر لی تھی بلکہ وہ بار بار پنجہ اٹھا کر صالحہ کے ملنسار ہاتھ پر چپت بھی لگاتے ہوئے اس کے اندر دہشت پیدا کرنے کے لیے اپنے گیلے کچلی دانتوں کو ننگا کر لیتا۔ شاید اسے لاڈ پیار کی عادت نہیں تھی۔ ''ہماری اپنی دو بلیاں ہیں جن کا ہم اچھا خیال رکھتے ہیں، گرچہ ان دنوں کھانے کی تلاش میں انھیں پاس پڑوس کے گھروں میں جھانکنا پڑتا ہے، بلکہ ایک بار تو میں نے انھیں گھاس پر بھی منھ مارتے دیکھا ہے۔''

''بہت خوب۔ میں نے اس لیے پوچھ لیا کیونکہ ہماری مالکن کے پاس ڈھیر ساری بلیاں ہیں جو پورے گھر میں آفت مچاتی رہتی ہیں، بلکہ ہر صبح مجھے ان کے لیے بازار سے ایک کلو مچھلی الگ سے خرید کر لانی پڑتی ہے۔ ہو سکتا ہے پچھلی نوکرانی ان بلیوں سے تنگ آ کر کام چھوڑ کر چلی گئی ہو کیونکہ ایک بار اسے

ایک بلی نے کاٹ لیا تھا اور مالکن کو اسے لے کر سوئی لگوانے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ اور بی بی، اس بلے سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔ یہ سڑک چھاپ بلا ہے جس کے لیے گھر کی چہار دیواری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اوپر سے اسے ہر چیز چٹ کر جانے کی عادت ہے، اور یہ بس اتنی ہی دیر رکنے والا ہے جتنی دیر اسے یہ گوشت کی چچڑی ہوئی ہڈیاں نظر آئیں گی۔ تم دیکھ رہی ہو، اس کا مزاج ہر وقت ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ اسی لیے اس نے کاٹ لیا تو میری صلاح مانو، انجکشن بھی کام نہ آئیں گے۔" اور اس نے سالن کا کٹورا اٹھا کر باقی بچا ہوا جوٹھا زمین پر انڈیل دیا۔

"مجھے بلیوں کو سدھانا خوب آتا ہے،" صالحہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "شادی سے پہلے میں نے جس گھر میں پرورش پائی تھی گرچہ وہ میرے منھ بولے باپ کا گھر تھا مگر وہ انسانی گھر کے ساتھ ساتھ بلیوں کا اچھا خاصا مسکن بھی تھا جہاں گھر سے لے کر کھلیان تک جھنڈ کے جھنڈ بلیاں گھوما کرتیں۔ اور اکثر راتوں کو جب چاند آسمان پر نکل آیا ہو، دیوار پر کھڑے ہو کر بچوں کی طرح اس قدر دہاڑیں مار مار کر روتیں کہ ہمارے کلیجے کانپ جاتے۔ میں آج بھی ان آوازوں کو اپنے خواب میں سنا کرتی ہوں۔ کیا ان جانوروں کی زندگی بھی ہم انسانوں کی طرح دکھوں سے بھری ہوتی ہے؟"

"میں نے سنا ہے بلیوں کو بد روحیں نظر آتی ہیں جن سے وہ انسانوں کو ہوشیار کرتی ہیں۔ ویسے اگر تمھارا اشارہ اللہ کی طرف ہے تو میں بتاؤں، میں اللہ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ میں بس اتنا جانتا ہوں، یہ سارا کچھ ان ہی کا کیا دھرا ہے۔ باقی میں تو ایک سیدھا سادا مسلمان ہوں، ہر جمعے کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتا ہوں اور کوئی درگاہ نظر آجائے تو فاتحہ پڑھنا نہیں بھولتا۔ رہیں بلیاں، تو میں نے بلیوں کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ مگر مجھے لگتا ہے تم بالکل صحیح جگہ پر آئی ہو۔"

اور بسیار گو دربان نے اس کے لیے لوہے کا پھاٹک کھول دیا۔

6

پھاٹک کے اندر ایک پختہ آنگن تھا جس کی پوری لمبائی پر سیمنٹ کا ایک سرخ برآمدہ پھیلا ہوا تھا۔ برآمدہ کافی اونچا اور مدوّر ستونوں پر ٹکا ہوا تھا جن کے پلستر پر ابھارے گئے دبیز بیل بوٹوں پر برسہا برس کے رنگ و روغن کے باوجود کلونس کے آثار نظر آرہے تھے۔ برآمدے کی سیڑھی نیم دائرے کی شکل میں

آکر ایک صحنک پر ختم ہوتی تھی جس پر ایک بجھی ہوئی لالٹین رکھی تھی۔ لالٹین کے سامنے ایک صاف ستھری مگر بہت ہی لاغر بلی زمین پر آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹی تھی۔ صالحہ کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر اپنی پراسرار آنکھوں کو کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ بلی کی دائیں آنکھ کے پپوٹے آپس میں جڑے ہوئے تھے جو شاید اس کا پیدائشی نشان تھا۔ صالحہ نے جھک کر بلی کو گود میں اٹھایا تو اسے اس کا مریل پیٹ عجیب طرح سے ڈولتا نظر آیا۔ اس کی لاغر گردن کو سہلاتے ہوئے اس نے زینے پر پہلا قدم رکھا تھا کہ اسے برآمدے کے حاشیے پر ایک عورت کی گلابی رنگ کی چپلیں نظر آئیں جن کے فیتوں سے نکلی ہوئی نسوانی انگلیاں کبوتر کے پیروں کی طرح گلابی تھیں۔ اس نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا اور اس کی سانس رکی کی رکی رہ گئی۔

کیا وہ برآمدے پر کھڑی خود اپنی طرف تاک رہی تھی؟

7

عورت کی آنکھوں میں بھی وہی حیرانی لکھی ہوئی تھی جو صالحہ کی آنکھوں میں تھی۔ خود دونوں بلیاں جو برآمدے پر بید کی سیدھی پشت والی کرسیوں کے ہتھوں پر بیٹھی تھیں، سر گھما گھما کر دونوں کی طرف باری باری سے تاک رہی تھیں جیسے وہ بھی اس واقعے سے حیران ہوں۔ عورت کی گود میں ایک بلی کا بچہ تھا جس کی پیٹھ کو وہ صالحہ کے انداز میں ہی سہلا رہی تھی۔ دونوں برآمدے اور صحن میں کھڑی ایک دوسرے کا جائزہ لے رہی تھیں جب بلی کا بچہ عورت کی گود میں چلبلایا اور ایسا محسوس ہوا جیسے عورت خواب کی دنیا سے جاگ گئی ہو۔ اس نے جھک کر بچے کو زینے پر چھوڑ دیا جو چھلاوے کی طرح وہاں سے غائب ہو گیا۔ وہ سیڑھی اتر کر صالحہ کے سامنے آکر رکی تھی اور اسی کی طرف تاک رہی تھی۔ صالحہ نے محسوس کیا، دونوں کے ہم شکل ہوتے ہوئے بھی ان کے درمیان کافی فرق تھا۔ صالحہ کے برعکس جس کا گیہواں رنگ سالوں سال کی غربت اور تنگدستی کے سبب مرجھا گیا تھا، برآمدے پر کھڑی ہوئی عورت کی جلد میں اب بھی تازگی اور چمک تھی۔ صالحہ کی آنکھیں جہاں زندگی کے اتار چڑھاؤ کے سبب اندر سے بجھی ہوئی تھیں، اس عورت کی آنکھوں میں ایک دائمی افسردگی کے باوجود زندگی کی رمق قائم تھی۔ یہی نہیں، ان کے رکھ رکھاؤ اور پوشاک میں زمین آسمان کا فرق تھا جنھوں نے دونوں کو الگ الگ دنیا کی مخلوق بنا رکھا تھا۔ مگر اس وقت وہ جس بے باکی سے صالحہ کی آنکھوں میں تاک رہی تھی، صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ ایک مستحکم

ارادوں والی عورت تھی جسے خواہ مخواہ کی پریشانیوں میں پڑنے کی عادت نہیں تھی۔

''کون ہو تم ؟ اور تمھیں دربان نے اندر آنے کی اجازت کیوں دی؟'' اس کی آواز میں وہی تذبذب قائم تھا جو اس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا، جیسے وہ اندر ہی اندر کسی ادھیڑ بن میں مبتلا ہو۔ اس کے بال پیچھے کی طرف کھینچ کر نفاست سے کنگھی کیے گئے تھے جس کے سبب پیشانی ابھر آئی تھی۔ ان بالوں کے نیچے، جن کے تار صبح کی پیلی دھوپ میں چمک رہے تھے، عورت کی افسردہ آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے صالحہ کو ایک ایسے کبوتر کا خیال آ رہا تھا جو زخمی ہونے کے باوجود اُڑتے رہنے پر مجبور ہو۔

''کیونکہ آپ کو چولھا چوکا کرنے کے لیے آدمی چاہیے تھا،'' صالحہ نے اس کی آنکھوں سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ زندگی نے اسے بہت ہی نچلی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

''بلی مجھے دو،'' بلی صالحہ کے ہاتھ سے لے کر وہ اس کی گردن کے بالوں کو جہاں جہاں صالحہ کے ہاتھ پڑے تھے اعلانیہ طور پر درست کرنے لگی۔ اس کی داہنی کلائی میں ایک قیمتی گھڑی بندھی ہوئی تھی جس کے ڈائل کا رنگ گلابی تھا۔ اس کی ساڑھی، بلاؤز اور چپل سے لے کر اس گھڑی کے ڈائل تک بتا رہے تھے کہ گلابی اس عورت کا پسندیدہ رنگ تھا۔ ''مجھے آدمی تو چاہیے اور تمھیں تنخواہ بھی اچھی ملے گی مگر اس سے پہلے تمھیں کئی امتحان سے گزرنا ہوگا۔ مگر تمھیں فضول کی باتوں سے گریز کرنا ہوگا۔ یہ تمھیں تھوڑا عجیب تو لگے گا مگر کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

''ہاں باجی، مگر میں دیکھ رہی ہوں وہ بیچاری پیٹ سے ہے اور اسے بھر پیٹ کھانا چاہیے۔'' صالحہ نے بلی کی طرف اشارہ کیا، اور جب وہ یہ کہہ رہی تھی تو پہلی بار اس کی نظر بلی کی بھاری دم پر پڑی جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لٹک رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا، بلی نے ایک بار بھی دم کو اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی، مگر گھر کی مالکن کی گود میں پہنچتے ہی بلی نے نہ صرف اپنے دونوں کان کھڑے کر لیے تھے بلکہ پہلی بار اس کی دم میں ایک اینٹھن نظر آ رہی تھی۔ خاتونِ خانہ نے بلی کا سہلانا روک کر حیرت بھری نظروں سے صالحہ کی طرف دیکھا۔

''تم نے بلی پر کیا جادو کر دیا ہے کہ اس کے اندر اجنبی پن جاگ اٹھا ہے؟ اور وہ حاملہ تو ہے، جو میں بھی دیکھ سکتی ہوں، مگر بچوں نے ابھی اس کے اندر حرکت کرنا شروع نہیں کیا ہے۔ پھر تم اس کے پیٹ کا ذکر کیوں کر رہی ہو؟'' وہ بلی میں پھر سے منہمک ہو گئی جو اس کے بار بار سہلانے پر پرسکون نظر آ رہی تھی۔

''کیونکہ کبھی ہمارے گھر میں ڈھیر ساری بلیاں تھیں اور مجھے ان کا تجربہ ہے،'' صالحہ نے جواز پیش کیا۔ ''میں نے دیکھا ہے، حاملہ بلیاں کسی آدم خور سے کم نہیں ہوتیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب انھیں کھلاتے کھلاتے ناک میں دم آ جاتا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو، میں اپنی بلیوں کا ٹھیک سے خیال نہیں رکھتی؟ وہ جنم سے ایک مرگھلی بلی رہی ہے جس کے بدن پر کھانا نہیں لگتا۔ وہ نہ صرف ایک آنکھ سے اندھی ہے، بلکہ اس کی دوسری آنکھ بھی کمزور ہے جس کی وجہ سے وہ بہت کم اِدھر اُدھر جا پاتی ہے، پھر بھی جانے کیوں اسے حاملہ ہونے کا خیال آیا۔ ویسے، ہم آج تک یہ سمجھ نہیں پائے کہ اسے ایک جلتی ہوئی لالٹین میں کیا بات نظر آتی ہے کہ وہ اس کے سامنے سوئی رہتی ہے یا بیٹھی اس کی لو کی طرف تاکتی رہتی ہے۔''

صالحہ اپنی جگہ چپ کھڑی رہی۔ وہ بلیوں کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی مگر اس بیمار بلی کا معاملہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنی جگہ خاموش کھڑی تھی، اس نے محسوس کیا کہ اس نے اپنی زبان کا کچھ زیادہ ہی استعمال کیا تھا، اور اب شاید ہی اس گھر پر اسے کام ملے۔

''نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا باجی۔'' اس نے معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کی، مگر اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اس پورے معاملے سے بری طرح تھک چکی تھی۔ اور پھر اس وقت بلی کے پیٹ کے ذکر کے ساتھ ہی صالحہ کو اپنے بچوں کی یاد آ گئی تھی جو گھر میں بھوک سے بلک رہے ہوں گے اور ہو سکتا ہے اسے لوٹتے نہ دیکھ کر محلے میں اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں۔ اس شہر میں بچے چرانے والے سارا سال آتے رہتے تھے۔

''تو پھر اس کے پیٹ سے تمھارا مطلب کیا تھا؟'' خاتونِ خانہ اس کے خیالات کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میرا کوئی مطلب نہیں تھا باجی۔ بس میرے بچے دو دن سے بھوکے ہیں اور میں انھیں گھر پر اکیلا چھوڑ کر آئی ہوں،'' صالحہ نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ اسے بلی کے لیے افسوس ہو رہا تھا جس کی ایک آنکھ نہیں تھی اور دوسری بالکل کمزور تھی، جو اتنی کم عمر میں ہی حاملہ ہو گئی تھی اور کسی اندرونی بیماری کے سبب کھانا جس کے بدن میں نہیں لگتا تھا۔ اسے اس بات کی بھی ندامت تھی کہ اس نے اس بے کس جانور کے معاملے سے اتنی جلد ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

''اگر گھر پر تمھارے بچے بھوکے ہیں تو یہ تمھارا نجی معاملہ ہے۔ مجھے ان چیزوں میں نہ گھسیٹو۔

بولو، امتحان کے لیے تیار ہو؟''

صالحہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کیا اس کے پاس اور کوئی راستہ تھا؟ اس کے گھر پر اناج کا ایک دانہ تک نہ تھا۔

''تم اس مکان کو دیکھ رہی ہو۔ یہاں نیچے سے لے کر دالان گھر تک، اور اگر چھت پر بنی چیل کوٹھی کو لیں تو اسے ملا کر، کل گیارہ کمرے ہیں جن میں سے زیادہ تر کمروں پر تمھیں تالے جھولتے نظر آئیں گے۔ تمھیں باقی کے کمروں کی صفائی کے ساتھ ساتھ دونوں طرف کے برآمدوں اور اندر باہر کا آنگن صاف رکھنا ہوگا۔ اس گھر میں میرے بچوں اور بلیوں کے علاوہ مالک مکان کا بھی ایک کمرہ ہے جس کے بارے میں تم کبھی کوئی سوال نہ کرنا۔ اور جیسا کہ تم پرانے گھروں میں دیکھتی آئی ہوگی، ہمارے گھر میں بھی تمھیں اندر اور باہر دونوں طرف ان گنت دروازے اور جھلملیاں نظر آئیں گی، اس لیے تمھیں کہیں جانے آنے کے لیے پریشانی نہیں ہوگی۔ تمھارا پہلا امتحان یہ ہے کہ اس گھر کو اوپر سے نیچے تک ٹھیک سے پہچان لو اور اس کے بعد کبھی غلطی سے بھی مالک مکان کے کمرے کے اندر میری لاعلمی میں داخل مت ہونا۔ وہاں ان کے کافی قیمتی کاغذات پڑے رہتے ہیں۔ پہلے کچھ دنوں تک میں تمھارے ساتھ رہوں گی تاکہ تمھیں کوئی بہانہ نہ ملے۔ مگر تم مجھ سے کبھی کوئی سوال نہیں کروگی۔ اور یاد رکھو، ہمیں دھول کا ایک ذرہ بھی نظر نہیں آنا چاہیے۔ مجھے دھول سے سخت الرجی ہے اور اس سلسلے میں ڈاکٹروں نے مجھے سخت تاکید کر رکھی ہے، اس لیے تمھیں ہر روز جھاڑن سے کھڑکیوں اور دروازوں کے جھول صاف کرنے ہوں گے۔ گھبراؤ مت، غسلخانے ہم خود صاف کرتے ہیں اور نالوں کے لیے الگ سے ایک مہتر مقرر ہے، اس لیے وہ تمھارا سر درد نہیں ہے۔ اور جب یہ سارے کام نپٹ جائیں تو تمھیں باورچی خانے کی ذمے داری سنبھالنی ہوگی جہاں خود بھی ہزاروں کام ہیں، مگر وہاں میں تمھارے ساتھ رہوں گی بلکہ وہاں پر سارے کام تمھیں میری نگرانی میں کرنے ہوں گے۔ ہم خاندانی پیسے والے ہیں اور ہمیں اچھے کھان پان کی عادت ہے۔ اس لیے ٹھیک سے سوچ لو۔ اگر تم یہ سارا کام سنبھال نہیں پاؤ گی تو اب بھی وقت ہے، واپس جا سکتی ہو۔ اور اگر تمھیں یہ سارا کام منظور ہے تو لالٹین اٹھا لو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ۔''

اور اس کا جواب لیے بغیر خاتونِ خانہ مڑ کر زینہ طے کرنے لگی۔

8

سیڑھیاں آگے پیچھے طے کرتی ہوئی دونوں برآمدے پر آئیں۔ برآمدے پر رک کر خاتونِ خانہ نے حاملہ بلی کو فرش پر ڈال کر بلی کے بچے کو اٹھا لیا تھا جو دوبارہ جانے کہاں سے نکل آیا تھا۔ مگر یہ کوئی دوسرا بچہ بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے صالحہ لالٹین کے ساتھ تھی۔ اس نے دیکھا، نہ صرف دونوں ایک ہی عمر اور قد و قامت کی تھیں بلکہ ان کے جسموں کی بناوٹ اور پشت کے پٹھوں اور کولھوں کے خطوط کی مشابہت کے سبب پیچھے سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا تھا۔ گھر کے اندر قبرستان جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ راہداریوں میں جو دروازے کھلے تھے ان سے کمروں کے اندر کسی کے ہونے کا گمان نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف کوئی کوئی بلی غیر متوقع طور پر ان کا راستہ کاٹ لیتی یا اپنی مختصر میاؤں واپس سمیٹ کر دیوار کی اوٹ یا اندھیرے میں غائب ہو جاتی۔ گھر کے روشندانوں میں یا دیواروں کے اوپر یا ستونوں کے کارنس پر یا باورچی خانے کے کلونس سے ڈھکے چھپر پر، غرض ہر جگہ بلیوں کے سائے نظر آ تو رہے تھے مگر بلیاں شاذ و نادر ہی دکھائی پڑ رہی تھیں۔ سارا گھر گھومنے کے بعد گھر کی مالکن دالان میں ایک خاص دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر چلی گئی۔ اس نے بلی کے بچے کو فرش پر چھوڑ دیا تھا جہاں بید کی کرسیاں غلاف سے ڈھکی ہوئی پڑی تھیں۔ غلافوں پر شبنم کے قطرے نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ صالحہ نے بلی کو زمین سے اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اس کی انگلیوں سے تڑپ کر کونے کی طرف دوڑ پڑی۔

''اس نے ایک مکڑی کو دیکھ لیا ہے جو کونے کی دیوار پر جالی بن رہی ہے۔'' اس کے کان میں خاتونِ خانہ کی آواز پڑی جو عین اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ ''گھر کی صفائی رک جائے تو یہی حال ہوتا ہے، مکڑیوں تک کی من مانی ہو جاتی ہے۔ اب یہ کل ہی کی بات ہے کہ ہماری ایک بلی باہر سے ایک چوہا مار کر لے آئی۔ وہ اسے کھانے کے لیے کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ ہم نے بہت مشکل سے چوہے کو اس کے چنگل سے چھڑایا جسے دربان کی مدد سے دریا کے کنارے کی زمین میں گاڑنا پڑا، تاکہ بلیاں مہک سونگھ کر پھر سے اس کا پتا نہ چلا لیں۔'' اس نے اشارے سے صالحہ کو کمرے کے اندر جانے کے لیے کہا جس کی صفائی کر کے تھوڑی دیر بعد وہ نمودار ہوئی تو گھر کی مالکن نے پوچھا:

''تمھارا کیا خیال ہے، یہ کمرہ میرے شوہر کا ہے؟''

''ہاں۔''

"تم نے ٹھیک پہچانا۔ مگر کیا تم مجھے بتا سکتی ہو تم نے یہ کیسے پتا چلایا؟"

"تقریباً ان تمام گھروں میں جن کے دروازے کھلے ہیں، خوشیاں جھلک رہی ہیں۔ صرف اس کمرے میں بستر ٹھنڈا پڑا ہے۔"

"کیا تم مجھ پر کسی طرح کا الزام عائد کر رہی ہو؟"

"نہیں باجی۔ میں تو آپ کے شوہر کو جانتی تک نہیں۔"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"صالحہ۔"

عورت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک پل کے لیے وہ اپنی جگہ خاموش کھڑی رہی، پھر لاپروائی سے شانے اچکائے اور منڈیر پر ہاتھ رکھ کر آسمان کی طرف تاکنے لگی جو کسی بھی دالان کی پہلی کشش ہوتی ہے۔

"تم پہلا امتحان جیت گئیں۔" اس نے اپنے بالوں سے ہاتھی دانت کی بنی ایک خوشنما کنگھی نکال کر اس کے حوالے کیا اور افسردگی سے اس کی طرف دیکھا۔ "اسے رکھ لو۔ کل سے کنگھی چوٹی کر کے، مانگ نکال کر، چوٹی باندھ کر آیا کرنا۔ مجھے الجھے ہوے بالوں سے ہول آتا ہے۔ ہم اس شہر کے پرانے لوگ ہیں اور ہمیں کھانے پینے کی چیزوں میں بال گرا ہوا دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔"

خاتونِ خانہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھی مگر صالحہ نے دیکھا، اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اس نے سہارے کے لیے باورچی خانے کے کواڑ کا اوپری سرا تھام لیا تھا۔ اس کی طرف تاکتے ہوے صالحہ کو ایک بار پھر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک ایسے کبوتر کو دیکھ رہی ہو جو اپنا لاغر سینہ لوہے کی ٹھنڈی گرِل پر رکھ کر کسی بھی پل دم توڑنے والا ہو۔

"اور اب تمھیں ان تین کمروں کی نشاندہی کرنی ہوگی جو میرے بچوں کے ہیں۔ تمھیں ان کا خاص خیال رکھنا ہے۔" باورچی خانے کا انتظام صالحہ کو سمجھا کر وہ اس کے چھوٹے سے برآمدے پر رک گئی جو اندرونی آنگن میں کھلنے والے برآمدے کا ہی حصہ تھا۔ "میں کافی تھک گئی ہوں۔ جب تک تم میرے بچوں کے کمروں کو ڈھونڈ کر ان کی صفائی نہیں کر لیتیں، میں ہم دونوں کے لیے چائے بناتی ہوں۔ میں تمھارا کام دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"یہ کام تو میرا ہے،" صالحہ نے انکساری سے کہا۔ "چائے میں بنا دیتی ہوں۔"

"نہیں، ابھی تمھاری نوکری پکی نہیں ہوئی ہے،" عورت پھر سے دروازہ ڈھکیل کر باورچی خانے کے اندر چلی گئی۔ صالحہ جب بچوں کے کمروں کا پتا چلا کر اور ان کی صفائی اور سجاوٹ کا کام ختم کر کے برآمدے کے کنارے لگے نل پر بالٹی اور صفائی والی گوودڑ دھو رہی تھی تو اسے خاتونِ خانہ بچوں کے کمروں سے لوٹتی نظر آئی۔ شاید اس کا کام دیکھنے وہ وہاں گئی ہوئی تھی۔ وہ باورچی خانے کے باہر رکھے تختہ پوش پر بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی۔ اس کا سانس پھولنا بند ہو چکا تھا اور وہ بشاش نظر آ رہی تھی۔ اس نے شاید اِنہیلر کا استعمال کیا تھا جو اس کے سامنے تختہ پوش پر رکھا ہوا تھا۔ صالحہ بالٹی اور دھونے والے کپڑے ان کی جگہ رکھ کر ہاتھ ساڑھی کے پلّو سے صاف کرتے ہوے اس کے قریب پہنچی تو خاتون خانہ کی پیالی خالی ہو چکی تھی۔ صالحہ نے دیکھا دوسری پیالی کی چائے ٹھنڈی ہو کر سطح پر بالائی کی تہہ جم گئی تھی۔

"تم نے بہت دیر لگا دی،" خاتونِ خانہ نے پینڈے کے نیچے سے ڈش نکال کر اس سے پیالی کو ڈھکتے ہوے کہا۔ "میں تمھاری چائے دوسری بار گرم نہیں کر سکتی۔ اس گھر میں فضول خرچی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"چائے کوئلے سے نہیں، میزبان کی گرمجوشی سے ابالی جاتی ہے،" صالحہ نے شال کو اپنے بدن کے گرد لپیٹتے ہوے کہا۔ وہ خاتونِ خانہ کے رویے سے حیران تھی۔ مگر وہ خود اپنے جملے سے خوفزدہ ہو گئی کیونکہ وہ یہاں پر کوئی مہمان بن کر نہیں آئی تھی، اور پھر جانے مکان مالکن اس کا کس طرح کا امتحان لے رہی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر تشفی ہوئی کہ خاتونِ خانہ نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ تو وہ گرسنگی سے چائے کی پیالی کی طرف تاکنے لگی جسے اب بھی گرم کیا جا سکتا تھا، مگر خاتونِ خانہ کے رویے سے لگ رہا تھا اب اس سے اس طرح کی توقعات رکھنا فضول تھا۔ "ویسے مجھے بچوں کے کمروں کا پتا تو دو منٹ میں چل گیا تھا مگر باری باری سے ان سے نکلنے میں وقت لگ گیا۔"

"وہ کیوں؟"

"میں ایسے کمروں کو سمجھ نہیں پا رہی تھی جہاں ہوا میں بچوں کی کلکاریاں تو ہوں اور دیواروں پر ان کی پرچھائیاں بھی رینگ رہی ہوں، مگر بچے نظر نہ آ رہے ہوں۔ یوں بھی مجھے چیزوں کو بے ترتیب دیکھنے کی عادت نہیں ہے، چاہے وہ خالی کمرے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور پھر وہ تینوں کمرے تو کھلونوں اور

کتابوں سے بھرے پڑے ہیں بلکہ کافی سجے سجائے کمرے ہیں''۔ دراصل ان کمروں کو دیکھ کر اسے اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے کمرے یاد آ گئے تھے جو اتنے سجے سجائے تو نہ تھے مگر ان کمروں کی طرح ہی ان میں کافی افراتفری رہا کرتی تھی۔

''کیا تم ہمیشہ اسی طرح دل توڑنے والی بات کیا کرتی ہو؟ یا پھر شاید تم ضرورت سے زیادہ تیز ہو۔ ویسے تم جیسے لوگوں سے جو مختلف گھروں میں کام کے بہانے جھانکتی پھرتی ہیں، اتنی امید تو رکھی جا سکتی ہے،'' خاتونِ خانہ نے اپنی کلائیوں سے چاندی کے دو کڑے اتار کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ''تم نے امتحان کم و بیش پاس کر لیا ہے۔ مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ میرے گھر میں کام کرنے والی عورت ننگی بُچی آئے جسے دیکھ کر باہر کے لوگ اس کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آنے کی کوشش کریں۔ ہمارا شہر اب بدل چکا ہے۔ اس میں باہر کے لوگ بڑی تعداد میں آ گئے ہیں۔ تمھیں تو پتا ہوگا، لوگ جب کام کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ان کے اندر کافی دیدہ دلیری آ جاتی ہے، خاص طور پر اگر اجنبی شہروں میں انھیں کوئی پہچانتا نہ ہو، پھر تو وہ بڑے سے بڑا جرم کرنے سے نہیں جھجکتے۔ مجھے امید ہے تم ان سے پرہیز کرو گی۔ کل سے تم کام پر لگ جاؤ اور چونکہ مجھے پتا ہے تمھارے گھر روٹی کے لالے پڑے ہیں، یہ ٹین کا ڈبا لے جاؤ۔ اس میں آٹا ہے جو ہمارے اپنے کھیت کے گیہوں کا پسا ہوا ہے، اور یہ رہے تھوڑے سے پیسے جن کا تمھاری پگار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر اب بھی ایک اڑچن ہے۔ تم مجھے بتاؤ، اپنے بچوں کا کیا کرو گی؟ تم اپنی گندی چوڑیاں اتار کر یہ کنگن ابھی سے پہن سکتی ہو۔''

''شکریہ باجی، میں کچھ نہ کچھ انتظام کر لوں گی۔'' کڑے پہنتے ہوئے (اس نے پرانی چوڑیاں اتاری نہ تھیں) جو اس کی کلائی کے لیے بالکل صحیح ثابت ہوئے تھے، صالحہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب اسے یہ دو منزلہ گھر نہ صرف صاف دکھائی دے رہا تھا جیسے برسوں سے وہ اس کے اندر رہتی آ رہی ہو، بلکہ اس کے کانوں میں بچوں کی کلکاریاں کافی تیز ہو گئی تھیں۔ تبھی اسے اپنے بچوں کا خیال آ گیا۔
''میں اپنے بچوں کو اکیلا چھوڑ نہیں سکتی، خاص طور پر اپنے چھوٹے بچے کو۔ وہ دماغی طور پر ایک کمزور بچہ ہے اور آئے دن بیمار پڑتا رہتا ہے۔ ویسے بھی آجکل شہر میں بچہ چرانے والے بڑی تعداد میں آنے لگے ہیں۔'' بائیں کلائی میں پڑے چاندی کے کڑے میں انگلی ڈال کر اسے گھماتے ہوئے اس نے اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔ وہ برآمدے میں کھلے ہوئے دروازوں کی طرف تاک رہی تھی جن کے لکڑی کے پالش

کیے ہوئے فریموں کے اندر شیشے آئینہ کی طرح چمک رہے تھے۔

''بچہ چرانے والے اس وقت بھی آیا کرتے تھے جب ہم اور تم چھوٹی تھیں،'' خاتونِ خانہ نے اس کے اندر پیدا ہونے والی نفسیاتی تبدیلی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم ان کے چنگل سے بچ نکلیں اور آج ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہیں ورنہ ہم بھی کسی کوٹھے میں کھڑی گاہکوں کو رِجھا رہی ہوتیں یا لولی لنگڑی بن کر بھیک مانگ رہی ہوتیں۔ ویسے اور سب چیزوں کی طرح بچے پکڑنے والے بھی دنیا میں ہمیشہ موجود رہیں گے، بلکہ انھیں رہنا بھی چاہیے ورنہ اتنی ساری پولیس چوکیاں ویران ہو جائیں گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمھیں بچوں کو یہاں لانے کی اجازت دے دوں۔ ہمیں بھیڑ کی عادت نہیں ہے۔ اسی لیے ہم نوکر بھی زیادہ نہیں رکھتے۔ میرا مشورہ مانو تو تم اپنے چھوٹے بچے کو کسی یتیم خانے میں ڈال آؤ۔ مجھے ایک یتیم خانے کا علم ہے جس کا اپنا ایک ذاتی مدرسہ ہے۔ اس کے سیکرٹری پر ہمارے بہت سارے احسانات ہیں۔ وہاں کے منتظمین بچوں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے ہیں بلکہ بچوں کو بھوکا رکھنے کے لیے انھوں نے ایسے نادر ہتھکنڈے ایجاد کر رکھے ہیں کہ انھیں دیکھ کر تم عش عش کر اٹھو گی۔ میں تمھیں یقین دلاتی ہوں، وہاں پر تمھارے بچے نہ صرف سدھر جائیں گے اور اس مشکل دنیا میں جینے کے لائق ہو جائیں گے بلکہ مولویوں کی سخت نگرانی میں پوری طرح صوم و صلات کا پابند ہو کر نکلیں گے۔''

''نہیں، میں نے اپنے بچوں کو لاڈ پیار سے پالا ہے... '' اپنے یتیم خانے کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے صالحہ کی ریڑھ کی ہڈی میں کپکپی دوڑ گئی۔ اسے یہ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ خاتونِ خانہ نے یتیم خانے کا ذکر کتنی بے تکلفی سے کیا تھا جیسے وہ اسی یتیم خانے کی بات کر رہی ہو جہاں صالحہ اپنی زندگی کے سات برس گزار آئی تھی۔ ''ہم غریب لوگ ہیں مگر اتنے بھی نہیں کہ اپنے زندہ رہتے بچوں کو یتیم خانے کے حوالے کر دیں۔ میں اپنا کوئی رشتہ دار یا جاننے والا ڈھونڈ نکالوں گی جو بچوں کی دیکھ بھال کر سکے یا جس کے پاس میں اپنی غیر حاضری میں بچوں کو چھوڑ سکوں۔''

''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمھارا شوہر نکما ہے؟''

صالحہ خاموش رہی۔ اس نے محسوس کیا ہمیشہ کی طرح آج بھی اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ خاتونِ خانہ نے مزید کرید کیے بغیر اسے دوسرے دن سے کام پر آنے کے لیے کہا۔ صالحہ

برآمدے کی سیڑھی اتر رہی تھی جب اس نے دیکھا، بجھی ہوئی لالٹین کی چمنی صاف کردی گئی تھی اور شاید اس میں تیل بھر دیا گیا تھا کیونکہ اس کے پیندے کے نیچے فرش پر تیل کا تازہ نشان نظر آرہا تھا۔ خود موٹی دم والی بیمار بلی صحنک پر لالٹین کے سامنے پچھلی بار کی طرح آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ صالحہ اس کے سامنے سے گزری تو اس نے پہلے کی طرح سر اٹھا کر اس کی طرف اپنی صحتمند آنکھ سے دیکھا، مگر پہچاننے سے انکار کردیا۔ بلیاں، صالحہ نے مسکرا کر سوچا، اگر وہ اس طرح سے پیش نہ آئیں تو بلیاں ہی کیوں کہلائیں؟ پھاٹک کے اندر اسٹول پر بیٹھے ہوئے دربان نے اسے کام ملنے کی مبارکباد دی۔ اس کے جسم سے کیروسین تیل کی مہک آرہی تھی۔ اس کی بڑی آنکھ میں اب بھی تحیر قائم تھا جبکہ چھوٹی آنکھ اپنے اندر کی طرف مڑی ہوئی تھی۔

''تم نے مالکن کو دیکھا؟''

''ہاں۔ اور میں نہیں جانتی میں کیا کہوں۔''

''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی میں اس سے بھی حیرت انگیز واقعات ہوا کرتے ہیں۔ ذرا سوچو، پہلی بار اس گھر میں مالکن اور نوکرانی ایک ہی نام سے پکارے جائیں گے بلکہ کوئی بھی انھیں دیکھ کر دھوکا کھا سکتا ہے۔'' بڑی آنکھ نے مسکرا کر کہا۔ ''بی بی، تمھیں یہ عجیب نہیں لگتا؟ کیوں نہ تم اپنا نام بدل لو۔ اس طرح چیزیں گڈمڈ ہونے سے بچ جائیں گی۔''

''مجھے نہیں پتا،'' صالحہ دربان کی بڑی آنکھ سے احتراز کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر مالکن نے کہا ہے تو ہم یہ بھی کرلیں گے۔ کیا مالکن نے ایسی کوئی بات کہی ہے؟''

''نہیں، ہماری مالکن نوکروں سے مشورے نہیں لیا کرتیں۔ ویسے تم واقعی ایک بہادر عورت ہو۔ تم میں صحیح فیصلہ لینے کی طاقت ہے جسے لینے میں تم دیر بھی نہیں لگاتیں۔'' چوکیدار سر جھکا کر ہتھیلی پر کھینی گھسنے لگا۔ سورج کی تیز دھوپ میں اس کی دورُخی داڑھی تمتما رہی تھی۔ ''مگر میں بتاؤں، میرا مشورہ اتنا برا بھی نہیں ہے۔ جب سے باہر سے پیسہ آنے لگا ہے، یہ سارا شہر اجنبیوں کے ساتھ ساتھ نقلی ناموں سے بھر گیا ہے۔ بلکہ میں تو ایک ایسے ڈرائیور کو جانتا ہوں جس نے اپنے چار چار نام رکھے ہوئے ہیں اور ان ہی کی مناسبت سے اس نے کاغذات بھی بنا رکھے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اس سے الگ الگ فرقوں میں کام ملنے میں آسانی ہوتی ہے۔''

''مگر اس کا کوئی تو اصلی نام ہوگا؟''

''میں نے پوچھا تھا۔ تم یقین نہیں کروگی، وہ اسے بھول چکا تھا،'' دربان نے کھیسیں نکالتے ہوے کہا۔ ''ذرا سوچو۔ اپنا اصلی نام بھول جانا۔ پھر آدمی کے پاس کیا بچتا ہے بھلا جسے وہ اپنا کہہ سکے؟ تمھیں اگر میری بات سے اتفاق نہیں تو نہ میں سر ہلا سکتی ہو۔''

''نہیں،'' صالحہ نے مضبوطی کے ساتھ کہا۔ ''میں صالحہ ہی ٹھیک ہوں اور اسی نام کے ساتھ مرنا پسند کروں گی۔ اور مجھے نہیں لگتا، مالکن کو کوئی اعتراض ہونا چاہیے۔ ورنہ مجھے کوئی دوسرا گھر ڈھونڈنا ہوگا۔''

''گھبراؤ مت، تمھیں نام بدلنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ تو میری اپنی رائے تھی۔ گھر کی مالکن کا مزاج تھوڑا سا سخت تو ہے کیونکہ وہ رہ رہ کر بیمار پڑتی رہتی ہیں، شاید اسی لیے وہ تھوڑی چڑچڑی نظر آتی ہیں، مگر وہ دل کی اتنی بری نہیں ہیں، نہ ہی اتنی ضدی ہیں کہ اپنی کسی بات پر اڑی رہیں۔ یہ شہر کے پرانے لوگ ہیں اور ایک وقت تھا کہ شہر کی آدھی زمین ان لوگوں کی ملکیت تھی، مگر اب یہاں کی ساری زمینیں بک چکی ہیں، صرف گاؤں میں تھوڑے سے کھیت اور زمینیں بچی ہیں جہاں سے اناج، غلہ اور پھل پھول آتے رہتے ہیں۔ کل ملا کر یہ اچھے لوگ ہیں، میں اس کی سند دے سکتا ہوں۔ اب مجھے ہی لے لو، میں پچھلے پندرہ برس سے، یعنی جب سے بڑا پل میں نے پار کیا ہے، یہاں پر دربانی کر رہا ہوں، مگر مجھے کبھی کام چھوڑنے کا خیال نہیں آیا۔ مجھے اچھی تنخواہ ملتی ہے اور مجھے یقین ہے جب میں یہاں سے کام چھوڑ کر جاؤں گا تو میرے پاس اتنا پیسہ ہوگا کہ مرتے دم تک مجھے پھر کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

دربان کی بات سنتے ہوے جانے کیوں صالحہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کے رضائی والدین کے بارے میں بات کر رہا ہو جن کی زمین پر سارا قصبہ بسا ہوا تھا، اور ان ہی لوگوں کی طرح اس کی شادی کے بعد سے ہی ان کی بھی زمینیں بکنی شروع ہوچکی تھیں۔

9

متواتر کئی دن کے فاقوں کے بعد گھر کے لوگوں نے بھر پیٹ کھانا کھایا تھا۔ بچے تھوڑی دیر تک باپ کے ساتھ کھیلنے کے بعد سو چکے تھے مگر صالحہ کی آنکھوں میں نیند کا کوسوں پتا نہ تھا۔ گھر اور باورچی

خانے کی صفائی کے بعد اپنی ذہنی کدورت دور کرنے کے لیے وہ سیڑھیاں طے کرتی ہوئی دالان گھر کی چھت پر چلی گئی۔ چاند کی تیز روشنی میں گھروں کے چھپر ایک دوسرے سے لگے ہوئے چٹانوں کے سلسلے کی طرح نظر آرہے تھے جن سے نکلے ہوئے بجلی کے کھمبوں پر بلب جل رہے تھے۔ ان کی طرف تاکتے ہوئے وہ اس بلبوں سے بھرے گھر کے بارے میں سوچنے لگی بلکہ اس سے زیادہ اس عجیب و غریب عورت کے بارے میں سوچنے لگی جس کے ساتھ جانے کیا وجہ تھی کہ اس کے ستارے ٹکرا گئے تھے۔ کیا واقعی اس آسمان کے نیچے اتنا بڑا اتفاق پیش آسکتا ہے؟ چاند پوری تابانی کے ساتھ آسمان پر موجود تھا اور سیمیں بادلوں کے پیچھے ستاروں کا ہجوم تھا جن کی طرف تاکتے ہوئے اسے ایک عجیب تنہائی کا احساس ہونے لگا جیسے وہ انسانوں سے دور کسی اکیلی دنیا میں کھڑی ہو۔ کیا پروردگار اوپر بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے؟ کیا اسے پتا ہے ہم انسان کتنی مصیبت بھری زندگی جی رہے ہیں؟ اور وہ عجیب گھر یہاں سے اتنی دور ہونے کے باوجود اسے رہ رہ کر اس کے خالی کمروں سے بچوں کی کلکاریاں کیوں سنائی پڑ رہی ہیں؟ لاشعوری طور پر چاندی کے کڑوں کو اپنی کلائیوں کے گرد چکر دیتے ہوئے (گھر آکر اس نے پلاسٹک کی چوڑیاں اتار پھینکی تھیں) اسے خاتونِ خانہ کی آنکھوں سے ٹپکتی ویرانی پھر سے یاد آنے لگی۔

اِس وقت اُس گھر کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک عجیب سا ڈر اس کے دل میں سمایا ہوا تھا، جیسے وہ ایک طلسمی دروازے کے سامنے کھڑی ہو اور عجیب و غریب چیزیں عالمِ غیب سے نکل کر اچھل کود مچانے کے لیے بے چین ہو رہی ہوں۔ اسے تالاب کے کنارے بنا ہوا وہ گھر سمجھ میں نہیں آرہا تھا، نہ اس کا دربان، نہ خاتونِ خانہ، نہ وہ لوگ جو وہاں رہتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ایک بے نام سا خوف اس کے اندر سما گیا تھا۔ شاید وہ کل وہاں پر کام پر نہ جائے، کسی دوسری جگہ کام ڈھونڈ لے۔

رات بھیگ چلی تھی مگر وہ اسی طرح چھت پر کھڑی محلے کے سناٹے کو سنتی رہی جو تنہائی کے ان لمحوں میں ہمیشہ اس کے ساتھ باتیں کیا کرتا۔ ہوا چھپروں کے اوپر بہتی ہوئی تیز ہو گئی تھی جس کے سبب محلے سے ہر طرح کی بو باس دالان پر آ گئی تھی۔ آسمان پر کچھ نئے بادل آ گئے اور دھوئیں کی طرح گزرنے لگے جن کے اندر چاند، جس کی روشنی ماند پڑ گئی تھی، کسی گیند کی طرح پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ نیچے لوٹی تو کمرے کا بلب جل رہا تھا اور اس کا شوہر چارپائی پر کھڑکی کی طرف پشت کیے ہتھیلیوں سے مچھر مار رہا تھا۔ یہ ایک نادر واقعہ تھا۔ صالحہ نے اسے کبھی مچھر مارتے یا گرمی سے پریشان ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

رات کے وقت وہ کم ہی جاگتا اور جاگتا بھی تو سیدھے غسلخانے کی راہ لیتا جہاں سے واپسی پر چادر ناک تک کھینچ کر گہری نیند سو جاتا۔ اور آج تو اس نے نہ صرف بھر پیٹ کھانا کھایا تھا بلکہ شراب کے ٹھیکے سے ایک بوتل بھی خرید کر لایا تھا جسے صالحہ نے اسے کھولتے تو نہیں دیکھا تھا مگر ایک عادی شرابی سے آپ یہ کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ گھر پر شراب کا انتظام ہو اور وہ خالی پیٹ سو جائے؟ ظاہر تھا جس شخص کے خراٹے لینے کی بات تھی وہ نہ صرف جاگ رہا تھا بلکہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔

"میں بہت تھک چکی ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے،" صالحہ نے اس سے نظر بچاتے ہوئے بستر کی طرف قدم بڑھایا جس پر اس کا چھوٹا بچہ سویا ہوا تھا۔ گرچہ اسے اپنے شوہر کی آنکھوں میں کسی شہوانی خواہش کی رمق دکھائی نہیں دی تھی مگر ان مردوں کے بارے میں کچھ بھی یقین سے کہا نہیں جا سکتا، اور وہ آج کسی بھی حالت میں اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کی ماہواری کو کچھ ہی دن رہ گئے تھے مگر اب وہ کسی نئے بچے کا خطرہ اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔

"تو پھر تم سو کیوں نہیں جاتیں؟" اس کا شوہر اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے صالحہ کو بستر پر بچھی چادر کی شکنیں درست کرنے میں مدد دی اور اسے کندھے سے تھام کر احتیاط سے پلنگ پر بٹھایا۔ "تم اُس منحوس گھر سے جب سے آئی ہو، بہت بے چین نظر آرہی ہو۔ تمھیں یہ ہو کیا گیا ہے صالحہ؟ آؤ، ہم اپنی سہاگ رات کو یاد کرتے ہیں۔ تمھیں یاد ہے جب تم شادی کر کے آئی تھیں تو کتنی کمسن تھیں، اور میں نے تم سے کیا کہا تھا؟"

"تم نے کہا تھا، یہ ان لوگوں نے کیا کیا، میرے گلے میں ایک بچی لٹکا دی! ابھی تو تمھاری لوری سننے کی عمر ہے، اور تم ایک لوری سنانے پر بضد ہو گئے تھے،" صالحہ ہنستے ہوئے بولی۔

"بالکل یہی جملے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ تمھیں حرف بہ حرف یاد ہیں۔ اور میری بات سن کر تم ہنسی کے مارے کیسی لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں؟ یاد ہے تمھیں؟ اس دن تم نے وہ لوری نہیں سنی تھی۔ کیا تم وہ لوری سننا چاہو گی؟ اور تمھیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ جب میں نے تمھیں دیکھا تھا تو پہلی ہی نظر میں تمھارا کتنا دیوانہ ہو گیا تھا۔"

صالحہ کو اپنی سہاگ رات کی ایک ایک بات یاد تھی، کیونکہ یہ وہ رات تھی جس سے وہ بری طرح خوفزدہ تھی، اس سے قطع نظر کہ اس رات ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا جس کے بارے میں وہ اپنی

سہیلیوں سے پچھلے ایک برس سے سنتی آئی تھی یا خود سرگوشی میں انھیں کچھ بتا پاتی۔ بلکہ اسے یہ بھی یاد تھا کہ تین سال تک کس طرح اس کے شوہر نے ایک بچی سمجھ کر اس سے کوئی جسمانی تعلق قائم نہیں کیا تھا اور ان کی اولاد نہ ہوتے دیکھ کر اس کے رضائی والدین کو دوہری تشویش ہونے لگی تھی۔

''نہیں، مجھے تم سے لوری نہیں سننی۔ اور تم کبھی میرے دیوانے نہیں ہوے تھے۔ اپنی مسخری بند کرو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم گھر کی مالکن ہو۔'' اس کے شوہر نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوے اس کی طرف دیکھا اور صالحہ کو تکیہ پر سر ٹکاتے دیکھ کر بلب بجھا دیا۔ شاید آسمان میں بادلوں کے آجانے کے سبب چاند پوری طرح مدھم پڑ گیا تھا کیونکہ محلے میں پوری طرح خاموشی چھا گئی تھی۔ مگر کچھ ہی وقت گزرا ہوگا کہ گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی درزوں سے روشنی کی نیلی لکیریں کمرے کی دیوار پر گرنے لگیں۔ صالحہ اس عجیب وغریب روشنی کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کے دروازے سے دس قدم کے فاصلے پر بجلی کا ایک کھمبا تھا جس کا بلب اگر بجھا ہوا نہ ہو تو اس سے ایک ہلکی سی یرقان زدہ روشنی گرتی رہتی۔ اچانک وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی کیونکہ یہی روشنی اب اس کے کمرے کے کھلے ہوے دروازے سے اندر فرش پر گر رہی تھی۔ روشنی کے اس مستطیل خانے میں ایک انسانی سر اور کندھے نظر آئے اور اسے دروازے پر خاتونِ خانہ کا چہرہ دکھائی دیا جو اپنی داہنی کہنی تھامے کھڑی اسی کی طرف تاک رہی تھی۔

''تم نے اتنا مجھے سوچا ہے کہ مجھے آنا پڑا۔ تمھیں کیا لگتا ہے، اس انسان کے ہوتے تم میرے گھر پر کام کر سکوگی؟'' وہ پلنگ کے سامنے رک گئی تھی۔ صالحہ کا شوہر جاگ کر بستر پر بیٹھا تحیر کے عالم میں پلکیں جھپک رہا تھا۔ ''تم خود دیکھ سکتی ہو تمھارا گھر والا کیا چاہتا ہے۔ تمھارا گھر والا چاہتا ہے کہ تم سو جاؤ تا کہ وہ اپنی شراب کی بوتل باہر نکال سکے۔''

وہ سانس روکے خاتونِ خانہ کی طرف تاک رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے سارے الفاظ کھو گئے ہوں۔ تبھی اس کا شوہر چارپائی سے اٹھا اور خاتونِ خانہ کے روبرو کھڑے ہو کر معاندانہ نظروں سے اس کی طرف تاکنے لگا۔ خاتونِ خانہ کے چہرے پر کسی قسم کا ردِ عمل نہ تھا جیسے اس کے شوہر کا [illegible]ے سے کوئی وجود نہ ہو۔ تنگ آکر وہ صالحہ کے بستر پر بیٹھ گیا اور اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر تکیہ پر اس کا سر لے جانے کی کوشش کی۔ ''بھول جاؤ اسے، اپنی آنکھیں بند کر لو۔ اس سے پیچھا

چھڑانے کا یہی طریقہ ہے۔'' صالحہ کو اپنی کنپٹیوں پر شوہر کی گرم انگلیوں کا احساس ہوا اور اس کی آنکھیں نیند میں ڈوبتی چلی گئیں۔

10

اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے اس کی نظر داخلے کے کمرے میں گئی اور اسے رات کا واقعہ یاد آ گیا۔ اس وقت رات کی ایک ایک بات، خاتونِ خانہ اور اپنے شوہر کا ایک ایک جملہ اس کے کان میں گونج رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کا شوہر اپنی چارپائی پر نہ تھا۔ برآمدے کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے آنگن میں کھڑا امرود کا درخت اور اینٹ کی چہار دیواری نظر آ رہی تھی۔ وہ دیر تک پیشانی پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ ہمیشہ کی طرح اس کا بچہ جاگ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ منھ دھلا کر اس نے برآمدے پر بچھی چوکی پر بٹھا دیا اور باورچی خانے میں چولھا جلاتے ہوے اس واقعے کو بھولنے کی کوشش کرنے لگی مگر روٹی سینکتے ہوے وہ اسے ہی یاد کر رہی تھی۔ اگر یہ خواب تھا تو اس خواب کے ذریعے وہ خود کو کیا پیغام دینا چاہ رہی تھی، اور اگر یہ خواب نہ تھا تو آج وہ خاتونِ خانہ کے سامنے کیسے جا سکے گی؟ باہر سورج نکل آیا تھا مگر دونوں لڑکے اب بھی بستر پر تھے۔ شوہر کے واپس آنے پر اس نے اس کے لیے چائے بنائی، بچوں کو جگا کر اسکول کے لیے تیار کیا اور جلدی جلدی آنگن میں نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ سنگھاردان کے سامنے بیٹھ کر چوٹی کرتے وقت اس نے ہاتھی دانت کی کنگھی کی طرف غور سے دیکھا اور اسے چرمی بیگ میں ڈال لیا۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے اپنے شوہر کی آنکھوں کو کئی بار پڑھنے کی کوشش کی، مگر اسے وہاں پر کچھ بھی غیر معمولی نظر نہیں آیا۔ وہ کپڑے اور جوتے پہن چکا تھا۔ صالحہ کو اپنی طرف تاکتے دیکھ کر وہ سوالیہ نظروں سے مسکرایا اور کام سے جلد واپس لوٹ آنے کا وعدہ کر کے باہر نکل گیا۔

11

یہ کام کا پہلا دن تھا، صالحہ نے گھر کا سارا کام پوری خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھال لیا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے وہاں پر کام کرتی آ رہی ہو۔ اس نے کئی بار خاتونِ خانہ کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی، مگر وہاں رات کے واقعے کی کوئی پہچان نظر نہ آئی۔ دوسرے دن اس کا شوہر کام

پر نہیں گیا، اور پھر یہ اس کا روز کا معمول بن گیا۔ شاید وہ بھی اسی وقت کے انتظار میں تھا جب اسے گھر کے اندر ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع ملے۔

صالحہ کو ہر روز چھ آدمیوں کے لیے کھانا بنانا پڑتا جس میں گیٹ کیپر بھی شامل تھا جس کے برتن الگ تھے جنھیں وہ خود دھویا کرتا۔ اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ خاتونِ خانہ اور اس کے شوہر کے علاوہ (جو اسے کبھی دکھائی نہیں دیا) گھر میں تین اور افراد ہوں گے۔ شاید یہ ان کے بچے ہوں۔ مگر وہ تینوں بچے کبھی اسے نظر نہیں آئے۔ یہ معاملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا، مگر ایک دانشمند عورت کی طرح اس نے اپنی خاموشی برقرار رکھی۔ وہ ہر صبح صحنک سے بجھی ہوئی لالٹین اور بھاری دم والی بلی اٹھا کر گھر کے اندر داخل ہوتی اور انھیں خاتونِ خانہ کے سپرد کر کے کمروں اور برآمدوں کی صفائی میں لگ جاتی۔ صاحب خانہ کا بستر ہمیشہ ایک سی حالت میں دکھائی دیتا جیسے اس پر چیونٹی بھی نہ چلی ہو۔ دوسری طرف بچوں کے بستروں پر اچھی خاصی افراتفری نظر آتی بلکہ ہاتھ رکھنے پر صالحہ کو ایک عجیب گرمی کا احساس ہوتا۔ وہ اپنے اندر اٹھنے والے سوالوں سے بے چین تو تھی مگر اس نے زبان کھولنے سے احتراز کیا تھا کیونکہ پہلے ہی اس نے ضرورت سے زیادہ باتیں کی تھیں۔ ویسے بھی اسے پتا تھا کہ ہم ساری زندگی کس طرح اپنے بنائے ہوئے واہموں کے جال میں قید رہتے ہیں۔ اور اس کی منہ بولی ماں بتایا کرتی تھی، اگر کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش آ جائے جسے تم سمجھنے سے قاصر ہو تو ضروری ہے کہ صحیح وقت کا انتظار کرو، جلد یا بدیر زندگی کی ساری گتھیاں اپنے آپ سلجھ جاتی ہیں۔ مسئلہ تب اٹھ کھڑا ہوتا ہے جب ہم اپنا صبر کھو بیٹھتے ہیں اور بند دروازوں سے سر ٹکرانا شروع کر دیتے ہیں۔ کمروں کی صفائی کرتے ہوئے اس نے دیکھا تھا، گھر کا بڑا حصہ نہ صرف خالی اور سنسان پڑا رہتا بلکہ پیچھے کی طرف کا باغ بالکل جنگل ہو رہا تھا اور اس کی زمین پر پچھلی خزاں کے پتے سڑگل رہے تھے۔ پہلی منزل سے باغ کی چہاردیواری سے باہر کی ڈھال نظر آتی تھی جہاں ندی کے کنارے آس پاس کے گھروں کے کوڑا کرکٹ ڈالے جاتے تھے۔ اس طرف کی زمین بالکل بنجر تھی، اس لیے مویشی کچرے کے ڈھیروں پر کھڑے پولیتھین کے ٹکڑے چباتے نظر آتے یا آس پاس کے گھروں کی مرغیاں دانے دُنکے کی تلاش میں اپنے چوزوں کے ساتھ کچرے کے ڈھیروں کو پنجوں سے کھرچتی رہتیں۔ دریا کا دوسرا کنارہ ریت کے خشک تودوں اور ان پر جگہ جگہ اگی ہوئی جنگلی جھاڑیوں کے سبب کسی ریگستان کی طرح نظر آتا۔ دریا سے تھوڑا اوپر ظروف کا ایک کارخانہ تھا جو برسوں سے بند پڑا

تھا۔ کارخانے کے شیڈ میں ایک بڑا سا سوراخ ہو گیا تھا جیسے آسمان سے اس پر گولا داغ دیا گیا ہو۔ جاڑا ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا مگر ابھی سے دریا میں پانی گھٹنوں گھٹنوں رہ گیا تھا۔ لوہے کا دروازہ کھول کر وہ باغ کے اندر گئی تو اس نے دیکھا، اس کی زمین پر جگہ جگہ گڈھے اور نالے بنے ہوئے تھے جن میں حالیہ کسی بارش کے سبب پانی جمع تھا۔ ان کچے نالوں کو دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے کسی خاص منصوبے کے تحت کام شروع کرنے کے بعد اچانک سارا کام ادھورا چھوڑ دیا گیا ہو۔ باغ کی پوری زمین جھاڑیوں اور خود رو پودوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ انجیر، ناریل اور نیم کے تنوں پر جنگلی بیلوں نے قبضہ جما رکھا تھا جن میں سے زیادہ تر سوکھ چکی تھیں جبکہ پپیتے کے تمام درخت سڑگل کر دیوار کے پلستر سے ٹک گئے تھے اور باغ کی ویرانی میں اچھا خاصا اضافہ کر رہے تھے۔ گڈھوں اور نالوں کو پھلانگتے ہوئے، جہاں پانی پر آبی بھنورے چل رہے تھے، ایک جگہ اسے پتوں کے ڈھیر پر ایک سبز رنگ کا نیم مردہ سنپولا نظر آیا جسے دو کوّے نوچ رہے تھے۔ اس نے کوّوں کو اڑا دیا اور لہولہان سنپولے کو رینگ کر نالے کے اندر جاتے دیکھتی رہی۔ اسے ان چیزوں سے نپٹنے کی عادت تھی۔ کونے میں مالی کا گھر تھا جس کا کھپریل کا چھپر سڑ چکا تھا اور دروازے اور کھڑکی پر لکڑی کے ناتراشیدہ تختے جڑ دیے گئے تھے جن پر کگرمتے اگ آئے تھے۔ باغ میں کیڑوں مکوڑوں اور مچھروں کی بھرمار تھی جنھیں دیکھ کر اسے نہ صرف مچھردانیوں کا راز سمجھ میں آ گیا جو گھر کے تقریباً تمام بستروں پر لٹک رہی تھیں بلکہ اسے یہ بھی پتا چل گیا کیوں خاتونِ خانہ ہر وقت عقب کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں کو بند رکھنے کی تاکید کیا کرتی۔ وہ دریا کی طرف کھلنے والے آہنی دروازے کے پاس کھڑی تھی جس پر اندر سے تالا لٹک رہا تھا اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی جب اسے بالائی منزل کی ایک کھڑکی پر خاتونِ خانہ نظر آئی جو سلاخوں سے گھڑی والا ہاتھ باہر نکال کر اسے واپس بلا رہی تھی۔ اسے اس کا باغ کے اندر جانا پسند نہیں آیا تھا۔ جب صالحہ نے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی تو اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر کہا، ''بھول جاؤ اسے۔ اس کا مالی مر چکا ہے۔ تمھیں اس باغیچے سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔'' ''مگر بی بی، کتنا خوبصورت باغیچہ ہے یہ۔ کیا برا ہے، اگر ہم اس کی تھوڑی صفائی کر لیں؟ گھر پر اتنے مچھر دکھائی نہ دیں گے۔ آپ کو مالی رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مجھے اس کام کا تجربہ ہے اور میں اس کے لیے الگ سے پیسے بھی نہیں لوں گی۔ مجھے پیڑ پودے بہت پسند ہیں۔'' اسے اپنے رضائی والدین کا باغ یاد آ رہا تھا جہاں اپنے جنون کے تحت وہ چوری چھپے پودوں کی رکھوالی

کیا کرتی تھی جنھیں وہ کھیت کی منڈیروں سے اکھاڑ کر لایا کرتی۔ ان میں زیادہ تر آم کے پودے ہوتے جو برسات کے دنوں میں اپنے بیج اور نوزائیدہ پتوں کے ساتھ مٹی سے باہر نکل آتے۔ اب وہ جب بھی وہاں بچوں کے ساتھ جاتی تو اسے یہ دیکھ کر کافی سکون ملتا کہ ان میں سے اس کے لگائے ہوئے کئی پودے ہرے بھرے شاداب درختوں میں بدل چکے تھے۔ ''نہیں، میں تم پر کام کا اور زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ اس سے دوسرے کاموں پر اثر پڑے گا۔ اور تمھیں نہیں لگتا تم ہمارے معاملات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگی ہو؟'' خاتونِ خانہ نے اس کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور صالحہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔ ویسے بھی اسے مہینے کے آخر میں اچھی تنخواہ ملنے والی تھی اور ہر روز جو بھی کھانا بچ جاتا اسے الگ سے گھر لے جانے کی اجازت تھی، جو مقدار میں اس کا اور اس کے شوہر اور بچوں کا ایک وقت کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہوتا۔ ظاہر تھا اپنی کسی بے وقوفی کے سبب وہ یہ کام کھونا نہیں چاہتی تھی۔

گھر کی صفائی میں بلیوں کا مسئلہ تو تھا مگر ان کے لیے دو کمرے الگ سے مخصوص تھے جہاں انھیں کھانا دیا جاتا تھا۔ اسی کمرے میں انھیں اجابت کی عادت بھی ڈلوادی گئی تھی اور ان لوگوں کی کوشش رہتی کہ وہ گھر پر گندگی نہ پھیلائیں۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ بلیاں اپنا کمرہ خوب پہچانتی تھیں۔ اسے اس بات کا پتا تھا کہ بلیاں صفائی پسند جانور ہیں اور جلد انسانوں سے گھل مل جاتی ہیں، شاید اسی لیے تیزی سے تعداد بڑھا لینے پر بھی انھیں سنبھالنا آسان ہوتا ہے۔ باورچی خانے کا سارا انتظام پہلے ہی صالحہ کے قبضے میں آ چکا تھا اور خاتونِ خانہ کے رویے سے لگ رہا تھا، اسے اس کے کام سے تشفی تھی۔ اب وہ بہت کم اس کے کام میں دخل دیتی۔ صالحہ نے کسی طرح اپنے شوہر کو راضی کر لیا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے وہ اس کی غیر حاضری میں گھر پر رہے اور بچوں کی رکھوالی کرے۔ یوں بھی اس کے خراد کے کام سے کون سا اس گھر کو فائدہ پہنچتا تھا؟ اور پھر ہو سکتا ہے وہ گھر پر رہنے لگے تو اس کی شراب اور جوے کی لت چھوٹ جائے اور ایک اچھا انسان بن کر وہ کوئی نیا کام شروع کر سکے۔ مگر وہ ایک آزاد فطرت آدمی تھا اور رہ رہ کر بچوں کو ان کے حال میں چھوڑ کر غائب ہو جایا کرتا اور جب واپس لوٹتا تو سر سے پیر تک لکڑی کے بُرادوں اور شراب کی مہک میں ڈوبا ہوا ہوتا، بلکہ کبھی کبھار اس کی ناک پر خون کا نشان بھی نظر آتا یا کُرتے کی جیب پھٹی ہوتی جو اس بات کا غماز تھا کہ وہ جوے کے اڈے سے ہو کر آ رہا ہے۔ اس کے لیے اسے صالحہ سے صلواتیں بھی سنی پڑتی تھیں جنھیں وہ سر جھکا کر چپ چاپ برداشت کر لیتا۔ اور صالحہ سوئی دھاگا لے کر

اس کی پھٹی ہوئی جیب سیتے ہوئے سوچا کرتی، ایسے آدمی کا کیا کیا جائے جو گز کی مانند سیدھا ہو اور ہر طرح کی بے حرمتی کے لیے تیار بیٹھا ہو؟

اسے کام پر لگے دوسرا مہینہ ہو رہا تھا جب ایک دن وہ کام سے واپس لوٹی تو اسے چوراہے کی خشک نالیوں میں پانی بہتا نظر آیا۔ سڑک کے کنارے دمکل کی ایک لال گاڑی کھڑی تھی جس کا انجن چل رہا تھا۔ اس کا پائپ زمین سے ہوتا ہوا کنویں کے اندر چلا گیا تھا۔ وہ کنویں کے سامنے جس سے ایک سیڑھی نکلی ہوئی تھی، لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئی۔ کچھ ہی وقت گزرا ہوگا کہ ایک گلہری کی دم نما مونچھوں والا فائر مین دھات کا ٹوپ پہنے کنویں سے باہر نکلتا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ سے دو مری ہوئی بلیاں لٹکا رکھی تھیں جن کے چاروں پیر رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ بلیوں کی دم اور مونچھوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور کیچڑ سے لتھڑے ہوئے بالوں سے کائی اور سڑے گلے پتے چپکے ہوئے تھے۔ کنویں کا پانی پمپ کے ذریعے باہر نکالا جا رہا تھا۔ نالوں کا پانی ابل کر سڑک پر بہتا ہوا گلی کے اندر جا رہا تھا۔ محلے کے لوگ اور بچے دمکل کی گاڑی کے پاس جمع تھے۔

''کوئی شرارت سے انھیں مار کر کنویں کے اندر ڈال گیا ہے،'' صالحہ کی آنکھوں کے تجسس کو دیکھ کر بھیڑ میں سے ایک شخص نے اس کے کان میں سرگوشی کی، اور یہ وہی شخص تھا جو ہمیشہ اس کے گھر کی خبر رکھا کرتا اور اسے دیکھ کر بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا اس کے پاس چلا آیا تھا۔ اس نے اپنی ناک پر رومال دبا رکھا تھا کیونکہ کیچڑ اور کائی کی تیز مہک ہر طرف پھیل گئی تھی۔ ''یا پھر کون جانے، شہر میں اچانک بلیاں مرنے لگی ہوں۔ مگر جس کسی نے بھی یہ کام کیا ہے، ہمارے حق میں اچھا ہی کیا ہے۔ تم خود دیکھ سکتی ہو، اس ملک میں کسی بھی طرح کی صفائی کے لیے اس طرح کے حادثات کا ہونا کتنا ضروری ہے!''

سر سے پاؤں تک پانی اور کیچڑ میں ڈوبا ہوا فائر مین مردہ بلیوں کو دونوں ہاتھوں سے لٹکائے کوڑے دان کی طرف جا رہا تھا جب صالحہ نے غور سے بلیوں کی طرف دیکھا۔ دیر تک پانی میں پڑے رہنے کے سبب ان کے جسم پھول کر کُپا ہو رہے تھے، پیٹ ڈول رہے تھے، اور آنکھوں کے کنچے حلقوں سے باہر نکلے پڑ رہے تھے۔ ان بے جان آنکھوں کی طرف تاکتے ہوئے صالحہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ تو اس کی اپنی ہی پالتو بلیاں تھیں جنھیں ان لوگوں نے کئی دن سے دیکھا نہیں تھا۔ کوڑا دان اوپر تک کچرے سے بھرا ہوا تھا اسی لیے بلیوں کی لاشیں اس کے باہر ہی کچرے کے ڈھیر پر چھوڑ دی گئیں۔

ومکل کے چلے جانے کے بعد صالحہ اپنے شوہر اور بچوں کی مدد سے بلیوں کو اٹھا کر گھر لے آئی اور پچھواڑے واقع تالاب کے کنارے کی کچی زمین میں دفن کر دیا جہاں محلے کی عورتیں راکھ ڈالا کرتیں اور بچے رفع حاجت کے لیے بیٹھا کرتے۔ دفن کرتے وقت ان لوگوں نے دیکھا، بلیوں کی جلد جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھی جن سے خون اور پیپ نکل آئے تھے۔ ان پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ صالحہ کو یہ سوچ کر افسوس ہوا کہ انھوں نے ان کا ٹھیک طرح سے خیال نہیں رکھا تھا، بلکہ اپنے خود کے فاقوں کے سبب وہ لوگ ان کے وجود کو ہی فراموش کر چکے تھے جس کے نتیجے میں انھیں باہر گھومنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ وہ ضرور کسی کے گھر پر رکھا کھانا چٹ کر گئی ہوں گی اور گھر کے مکینوں نے بدلہ لینے کے لیے ان کے پیروں کو رسی سے باندھ کر کنویں میں ڈال دیا ہوگا تاکہ وہ تیر کر جان نہ بچا سکیں۔

وہ گھر واپس لوٹے تو اس کے شوہر کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔

''وہ جانور تو تھیں مگر تھیں تو ہماری بلیاں،'' صالحہ نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم انھیں کوڑے دان میں چیل کوّوں کے لیے چھوڑ دیتے؟''

''تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو صالحہ۔ اس کے لیے میرا مزاج بگڑا ہوا نہیں ہے،'' اس کے شوہر نے ہمیشہ کی طرح اپنی مونچھ کے کونے کو چباتے ہوئے کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کسی نے ہم سے انتقام لیا ہے۔''

''کس نے؟'' صالحہ حیرت سے بولی۔ ''بھلے آدمی، ہم نے کیا کیا ہے کہ لوگ ہم سے انتقام لیں گے؟ ہوسکتا ہے بلیاں کنواں پھلانگتے ہوئے خود ہی ڈوب گئی ہوں۔ اب بھول بھی جاؤ اسے۔ کنویں میں پانی اکٹھا ہونے میں ابھی وقت لگے گا اور سرکاری نل پر شام سے پہلے پانی آنے سے رہا۔ سورج ڈوبنے میں بہت وقت پڑا ہے۔ تم چاروں گندے ہو رہے ہو۔ کیوں نہ تم لوگ تالاب سے بچوں کے ساتھ نہا دھو کر آ ؤ، تب تک میں ڈرم کے پانی سے نہا لیتی ہوں۔ میں تم لوگوں کے لیے بڑھیا کھانا لائی ہوں۔''

''ان روز روز کے جوٹھنوں سے تو میں تنگ آ گیا ہوں،'' اس کے شوہر نے آنگن میں تنی ہوئی رسی سے تولیہ کھینچتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی مالکن کو کیوں نہیں سمجھاتیں کہ وہ اس طرح کھانا برباد نہ کرے۔ ایسے لوگوں کے لیے کھانا بنانے سے کیا فائدہ جو موجود ہی نہ ہوں۔ آخر انھیں خدا کو منھ دکھانا ہے یا نہیں؟''

''تو تم خود کچھ کرتے کیوں نہیں؟'' صالحہ تلملا کر بولی۔ ''اگر تمھارے بدن سے شراب کی جگہ

صرف لکڑی کے بُرادوں کی باس آتی تو کیا ہم اس طرح بھوکوں مرتے یا مجھے کام کے لیے نکلنا پڑتا؟''

''تمھاری تان تو ایک ہی جگہ ٹوٹا کرتی ہے،'' اس کے شوہر نے دم دبا کر بچوں کے ساتھ تالاب کی طرف بھاگنے میں عافیت سمجھی۔

12

صالحہ کو اس عجیب و غریب واقعے سے دہشت نہ ہوتی اگر اسے جس گھر میں کام ملا تھا وہاں پر ڈھیر ساری بلیاں نہ ہوتیں۔ ظاہر تھا، اس واقعے کے ساتھ اسے اس گھر کا خیال آ جانا لازمی تھا، خاص طور پر اس عجیب و غریب بھاری دم والی بیمار بلی کا جو گھر میں بجلی کا انتظام ہوتے ہوئے بھی ایک بجھی ہوئی لالٹین کے سامنے بیٹھی اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اتنی لاغر بلی اپنے بچوں کو کیسے پیٹ سے باہر لا پائے گی؟ اگلے دن جب وہ کام پر گئی تو اس سے بلیوں کی موت کا ذکر سن کر خاتونِ خانہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر اس نے کرید بھری نظروں سے صالحہ کی طرف دیکھا۔

''تم بہت پریشان لگ رہی ہو؟ کیا بچے بلیوں سے بہت مانوس تھے؟''

''ایک وقت تھا کہ ہمارے گھر میں ڈھیر ساری بلیاں تھیں۔ مگر اب بس یہی دو رہ گئی تھیں۔'' صالحہ نے مسکرانے کی کوشش کی اور اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ نقلی مسکراہٹ انسان کو کتنی آسانی سے بے نقاب کر ڈالتی ہے۔ اس کے آنسو بہہ نکلے جنھیں اس نے ساڑھی کے کونے سے چھپانے کی کوشش کی۔

''اپنے آپ کو سنبھالو،'' خاتونِ خانہ نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے یہاں بہت ساری بلیاں ہیں۔ مگر میں چاہوں بھی تو تمھیں کوئی بلی نہیں دے سکتی، کیونکہ ایک تو ہم اپنی بلیوں سے بہت پیار کرتے ہیں، دوسرے، وہ لاڈ پیار سے بگڑی ہوئی بلیاں ہیں جو تم لوگوں کے گھر پر ٹک نہیں پائیں گی۔ اور میں بھلا یہ تم سے کیوں کہہ رہی ہوں؟ اب تک تو تمھیں ان باتوں کا پتا چل ہی گیا ہوگا۔ حالانکہ ہمارے یہاں کل ہی دو نئی بلیاں آئی ہیں جو سڑک چھاپ تو نہیں مگر انھیں دیکھ کر لگتا ہے وہ جہاں سے آئی ہوں گی وہاں پر انھیں اچھا کھانا نہیں ملتا ہوگا۔ یہ تو تمھیں بھی پتا ہوگا کہ کھانا اگر صحیح ملے تو کوئی بھی بلی اپنا گھر نہیں چھوڑتی۔ یہ انسانوں جیسا ہی معاملہ ہے۔ تو تم یہ دونوں بلیاں لے جا سکتی ہو۔''

Scanned with CamScanner

''نہیں باجی، بلیاں یہیں ٹھیک ہیں۔ ہمارے گھر میں تو خود کے کھانے کے لالے پڑے ہیں، ہم کیا بلیاں پالیں گے۔''

''یہ اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے، ورنہ لوگوں کو جب بلیوں کی عادت پڑ جاتی ہے تو وہ انھیں کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ہی نکالتے ہیں، بلکہ دوسروں کی بلیاں چرانے سے بھی باز نہیں آتے۔ تو جیسا کہ میں بتا رہی تھی، یہ دونوں نئی بلیاں سڑک چھاپ تو نہیں مگر بے حد گندی ہیں۔ انھیں دیکھ کر لگتا ہے انھیں صفائی کی عادت نہیں ہے۔ مگر ہمیں انھیں نہ صرف صاف کرنا ہوگا بلکہ انھیں صفائی کی عادت بھی ڈالنی ہوگی کیونکہ ہم نے اگر ایسا نہ کیا تو وہ گھر کے دوسرے جانوروں میں بیماری پھیلا دیں گی۔ تو تم پہلے اس ضروری کام سے نپٹو پھر دوسرا کام کرنا۔ بلکہ اس کام میں مَیں بھی تمھیں مدد دوں گی۔ میں نے دربان کی مدد سے دونوں کا پیٹ اچھی طرح سے بھر دیا ہے تاکہ انھیں پتا چل جائے وہ دوسری دنیا میں آچکی ہیں اور وہ بدتمیزی نہ کریں۔ ہم ایک ہفتے تک انتظار کریں گے۔ اگر کوئی ان کا دعویدار نہ نکلا تو جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر ان کا چیک اپ کرالیں گے اور اگر انھیں کوئی ناقابلِ علاج بیماری نہ نکلی تو ان کی گردنوں پر پٹا ڈال دیں گے، جب تک انھیں پوری طرح ہمارے گھر کی عادت نہ پڑ جائے۔''

''اور اگر انھیں کوئی بیماری نکل آئی تو آپ کیا کریں گی؟'' اس نے تشویش بھری نظروں سے خاتونِ خانہ کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے رضاعی والدین کے گھر پر گزارے گئے دن یاد آ گئے تھے جہاں اس نے کئی بار مالک کے حکم سے کارندوں کو کھلیان کی فالتو بلیوں کو تالاب میں ڈبو کر مارتے دیکھا تھا۔ اس قصبے میں مچھلی بازار کے نام کی کوئی چیز نہیں تھی جہاں وہ لوگ اس کے شوہر کی طرح بلیوں کو لے جا کر چھوڑ پاتے۔ سارے ہاٹ کھلے آسمان کے نیچے لگا کرتے جہاں گوشت اور مچھلی کا کاروبار سورج کے نصف النہار تک پہنچنے سے پہلے ختم ہو جاتا۔ ظاہر ہے، بلیوں کی بڑھتی تعداد سے پیچھا چھڑانے کے لیے نوکروں کو ہر تین چار سال میں ایسا کرنا پڑتا تھا۔ ان کی نظر میں بلیوں کی آبادی کو قابو میں رکھنے کا یہی بہتر طریقہ تھا جسے وہ دہائیوں سے کرتے آرہے تھے۔

''ہم انھیں آزاد کر دیں گے تاکہ وہ جہاں سے آئی ہیں وہاں لوٹ جائیں۔'' مکان مالکن اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے سوال کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ''وہ ہماری بلیاں نہیں ہیں کہ اس طرح کا کٹھور فیصلہ ہم لے سکیں جو تم سوچ رہی ہو، گرچہ میری رائے میں اگر انھیں کوئی بیماری

نکلی تو یہ ان کے حق میں برا نہ ہوگا۔''

صالحہ نے اطمینان کی سانس لی جیسے اس کے سر سے بلا ٹل گئی ہو۔ اپنی دونوں بلیوں کو کھونے کے بعد وہ مزید کسی گناہ کی مرتکب ہونا نہیں چاہتی تھی۔

صالحہ کی نظر جب دونوں بلیوں پر پڑیں تو اس کا کلیجہ اچھل کر ہاتھ پر آ گیا۔ دونوں نہ صرف اسی کی بلیوں کی عمر کی تھیں بلکہ وہ اس کی بلیوں کی طرح ہی دودھ جیسی سفید تھیں۔ یہی نہیں، جب دونوں مل کر بلیوں کو شیمپو سے غسل دے رہی تھیں تو صالحہ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکی کہ بلیوں نے جہاں ایک طرف بہت آسانی سے اپنے آپ کو اس کے ہاتھوں سونپ دیا تھا وہیں وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پنجوں سے نوچتے کھسوٹتے ہوئے خاتونِ خانہ کے کام میں رخنے ڈال رہی تھیں۔ صفائی کے بعد وہ مخصوص تولیہ سے بلیوں کا بدن صاف کر رہی تھیں جب ان کی آنکھوں کے کنچوں کو دیکھ کر صالحہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے لگا، یہ ہو بہو ویسے ہی کنچے تھے جو اس کی اپنی بلیوں کی آنکھوں میں نظر آتے تھے بلکہ ان کا دیکھنے کا انداز بھی ویسا ہی تھا۔ میرے خدا، کہیں میں نے کائی اور کیچڑ میں لتھڑے ہونے کے سبب غلط بلیاں تو دفن نہیں کی ہیں؟ اس نے باری باری سے بلیوں کو اپنے سامنے لٹکا کر تھوتھنی سے دم تک کا جائزہ لیا اور نفی میں سر ہلایا۔ نہیں، یہ وہ بلیاں نہیں ہو سکتیں۔ اسے ان کے پنجوں اور کانوں کی بناوٹ بالکل مختلف نظر آئی، اور پھر ان کے دم اینٹھنے کا انداز کتنا جارحانہ تھا۔ اس نے خود کو یقین دلا تو دیا کہ یہ اس کی بلیاں نہیں ہو سکتیں، گرچہ وہ اس احساس سے پیچھا چھڑا نہیں پا رہی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ڈھارس دینے کے لیے اس طرح کے نشانات بلیوں میں ڈھونڈ رہی تھی جو انھیں اجنبی ثابت کر سکیں، کہ دراصل یہ اسی کی اپنی بلیاں ہی تھیں جو اس گھر پر آ گئی تھیں اور جگہ بدلنے کے سبب تھوڑی الگ نظر آ رہی تھیں۔ اس واقعے کو سوچتے ہوئے اس کی کنپٹیوں میں درد کی ٹیسیں جاگ اٹھیں۔ اس نے سر جھٹک کر اس معاملے کو اپنے ذہن سے الگ کیا اور کام میں خود کو ڈبو دیا۔

13

صالحہ کو کام پر لگے ہوئے دوسرا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ اس نے نہ صرف پورے گھر کا کام اچھی طرح سنبھال لیا تھا، بلکہ بلیاں تک اس سے مانوس ہو چکی تھیں۔ یہاں پر اکثر بلیاں چوہا مار کر باہر سے لے

آتیں جنھیں ان کے چنگل سے بچا کر وہ بڑی چالا کی سے چھت پر کسی چیل کو دکھا کر پھینک دیا کرتی۔ چیل اس کی آنکھوں کے سامنے ہی جھپٹا مار کر چوہے کو لے اڑتی بلکہ اکثر تو ایسا ہوتا کہ چوہے کی لاش چھت کے فرش سے ٹکرانے سے پہلے ہی چیل کمال ہنرمندی کے ساتھ جھپٹا مار کر اسے اپنے پنجوں کے درمیان دبا کر لے جاتی اور صالحہ اس کی پھرتی پر عش عش کرتی رہ جاتی۔ باورچی خانے میں اس کا ساتھ دینے کے بعد مکان مالکن زیادہ تر وقت اپنی سلائی مشین پر مصروف رہتی یا انگشتانے پہنے کپڑوں میں ٹانکے لگاتی نظر آتی۔ ان دنوں ایک ڈرائیور بھی آنے لگا تھا جو کم عمر کا تھا اور گاڑی کی صاف صفائی کے بعد زیادہ تر وقت دربان کے ساتھ بیٹھا گپیں لڑایا کرتا۔ ایک دن خاتونِ خانہ نے گاڑی نکالنے کے لیے کہا اور صالحہ کو کام ختم کرنے کے بعد رکنے کے لیے کہہ کر پرانے بازار کی طرف چلی گئی۔ وہ واپس لوٹی تو ڈرائیور پولیتھن کی دو بڑی تھیلیاں اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ایک تھیلی صالحہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا،''اس میں تمھارے دونوں بچوں کے لیے کپڑے ہیں۔ سستے بک رہے تھے، میں نے خرید لیے۔ موسم بدل رہا ہے، انھیں گرم کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔ اور ان کپڑوں کا تمھاری پگار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''آپ کو ان کے سائز کا کیسے پتا چلا باجی؟'' کپڑے تخت پوش پر پھیلا کر وہ تعریفی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ مکان مالکن نے اس کے جڑواں بچوں کو دیکھا تک نہ تھا جب کہ وہ ان کے لیے بالکل صحیح ناپ کے کپڑے لے آئی تھی۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ تم ہمیشہ سوال کیا کرو؟'' مکان مالکن نے ناگواری سے کہا۔''کیا کپڑے تمھارے بچوں کو ٹھیک نہیں آئیں گے؟''

''بالکل ٹھیک آئیں گے، بلکہ یہ دونوں کپڑے تو میرے جڑواں بچوں پر خوب جچیں گے۔''

''میں تمھارے چھوٹے بچے کے لیے کپڑے لے آئی ہوں۔ میں خود انھیں سینا چاہتی ہوں۔ کسی دن تم اسے لے کر آؤ۔ اسے دیکھے بنا میں یہ کام نہیں کر سکتی۔''

''آپ کا یہ احسان ہم لوگ کبھی نہیں بھولیں گے۔''

''مجھے یہ گھسا پٹا جملہ پسند نہیں۔ اور یہ احسان نہیں ہے۔ نہ ہی ہمیں کسی پر احسان لادنے کی عادت ہے،'' مکان مالکن نے لاپروائی سے کہا۔''یہ اتفاق تھا کہ کپڑے سستے مل گئے۔ اور پھر تمھارے بچوں کو بھی پتا چلنا چاہیے کہ تم ایسے ویسے گھر پر کام نہیں کر رہی ہو۔''

اُس دن گھر لوٹنے میں اسے تھوڑا وقت لگ گیا۔ درختوں کے سائے پورب کی طرف مڑ کر لمبے ہونے لگے تھے جب وہ گھر لوٹی۔ اس نے دیکھا اس کا چھوٹا بچہ گھر پر نہیں تھا اور دونوں بڑے لڑکے جو آدھے گھنٹے کے آس پاس پیدا ہوئے تھے، دالان اور اس سے لگے چھپر پر اُدھم مچانے میں مصروف تھے۔ اس نے جب ان سے دریافت کیا تو پتا چلا کہ انھیں اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا۔ اس کے شوہر کے گھر پر ہونے کی بات تھی مگر وہ غائب تھا۔ شاید وہ محلے میں کہیں موجود ہو اور بچہ اس کے ساتھ ہو۔ اس نے کپڑوں کی تھیلی الماری میں بہت اندر ڈال دی۔ اس کا ارادہ اپنے چھوٹے بچے کے لیے اسی طرح کے نئے کپڑے لے آنے کا تھا یا اس وقت تک انتظار کرنے کا تھا جب تک مکان مالکن کے وعدہ کیے ہوئے کپڑے سل کر تیار ہو جائیں، تا کہ ایک ساتھ وہ ان کپڑوں کو نکال سکے اور بچوں کے درمیان کسی طرح کی دل شکنی نہ ہو۔ سارا محلہ تلاش کرنے کے بعد وہ چوراہے پر آئی تو اس کی نظر اپنے شوہر پر پڑی جو سرخ آسمان کے نیچے کنویں کے صحن پر اکیلا کھڑا تھا۔ وہ شدید نشے میں تھا اور سرکاری کنویں پر لگی چرخی کو انگلیوں سے گردش دیتے ہوئے کنویں کے اندر تاک رہا تھا۔ صالحہ نے جب اس سے چھوٹے بچے کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بھڑک اٹھا۔

''تمھارا کیا خیال ہے، میں ان پر نظر نہیں رکھتا؟'' اس نے صحن کے کنارے جمے ہوئے پانی پر تھوکتے ہوئے کہا۔''اب یہ چوزے نہیں رہے کہ انھیں خوانچے میں بند رکھا جائے۔ اور مجھے بھی تو سانس لینے کے لیے تھوڑی سی کھلی ہوا چاہیے۔''

''خدا کے بندے، یہ تم نے کیا کیا؟'' صالحہ دھم سے کنویں کے صحن پر بیٹھ گئی اور اپنا ماتھا ٹھونکنے لگی۔

''تمھیں پتا چلنا چاہیے، شہر میں بلیاں مرنے لگی ہیں اور بڑی تعداد میں بچے چرانے والے آ گئے ہیں۔''

''بچہ چرانے والوں کے بارے میں تم بیکار پریشان ہو رہی ہو صالحہ،'' اس کے شوہر نے اس کے پہلو میں بیٹھ کر نرم لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔''لوگ تو اس طرح کی افواہیں پھیلایا ہی کرتے ہیں، بلکہ کچھ کاہل لوگوں کا کام ہی یہی ہے۔ میں نے آج تک کسی بچہ چرانے والے کو نہیں دیکھا، سوائے ایک کے جو تین بچوں کا باپ تھا اور اسے لوگوں نے بچہ چرانے کے شبہے میں پیٹ پیٹ کر مار ڈالا تھا۔ جہاں تک ہماری بلیوں کا تعلق ہے، میں اب بھی کہہ رہا ہوں، کہ کسی نے ہم سے انتقام لیا ہے۔ رہا ہمارا بچہ تو وہ کوئی بلی کا بچہ تو ہے نہیں، آدمی کا بچہ ہے۔ آس پاس ہی کہیں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہوگا اور

بھوک لگتے ہی واپس لوٹ آئے گا۔ تم گھبراؤ مت، میں ہوں نا، میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ کیا میں نے اسی دن کے لیے تم سے شادی کی تھی کہ مصیبت کے وقت تمھیں اکیلا چھوڑ دوں؟ بس تم تھوڑا مسکرایا کرو۔ برے حالات کا سامنا مسکرا کر کرو تو بلا کٹ جاتی ہے۔ یہ اتنا سنجیدہ معاملہ نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ اور پھر ابھی تو سورج بھی نہیں ڈوبا ہے۔''

اس دن صالحہ بھوکی پیاسی اپنے شوہر اور بچے کا انتظار کرتی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بچہ خود سے باہر گیا ہوگا۔ وہ تو ہر وقت اپنی جگہ چپ بیٹھا رہنے کا عادی تھا۔ وہ کوئی چوزہ تو نہ تھا کہ کوئی چیل اسے اٹھا کر لے جاتی۔ رات ہوگئی، نہ اس کا بچہ لوٹا نہ اس کا شوہر۔ رات بھیگ چلی تھی جب وہ گھر سے نکلی اور دیر تک جان پہچان کے گھروں اور محلے میں کھلی جگہوں پر اپنے شوہر اور بچے کو تلاش کرتی پھری۔ واپس لوٹی تو دونوں بچے بھوکے ہی سو چکے تھے۔ آج اس پریشانی کی حالت میں وہ کھانا گرم کرنا بھول گئی تھی۔ اس نے بچوں کو جگایا، ہاتھ منھ دھلا کر ان کی نیند دور کی، ان کے لیے روٹیاں سینکیں اور مانگ کر لایا گیا سالن لگا کر انھیں کھلایا اور جب وہ دوبارہ سو گئے تو وہ چوراہے میں کنویں کے صحن پر بیٹھ کر شوہر کا انتظار کرنے لگی۔ یہاں سے دور دریا کا پانی نظر آ رہا تھا جس پر روشنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کنواں اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، آسمان پر دھندلے ستاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس افسردہ ماحول میں وہ زیادہ دیر تک اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور سر بازوؤں میں چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ کچھ ہی دیر کے اندر نقرئی بادلوں کے پیچھے سے آدھا چاند نکل آیا جو بالکل زرد ہو رہا تھا اور محلے کے سپاٹ چھپر دور تک دکھائی دینے لگے جن سے بجلی کے کھمبے اپنے ڈھکنوں والے بلب کے ساتھ نکلے ہوئے تھے۔ اسے یہ سوچ کر عجیب لگ رہا تھا کہ وہ کیسا خدا ہوگا جسے غریبوں کے آنسوؤں پر ذرا بھی ترس نہیں آتا!

وہ گھر واپس لوٹی مگر اپنے کمرے میں بلب کو جلا رہنے دیا۔ دوسرے دنوں کے مقابلے آج اندھیرے میں اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ سارا محلہ ویران پڑا تھا۔ اس کی وہی پرانی کیفیت واپس لوٹ آئی تھی، جیسے تمام لوگ اسے اکیلا چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے ہوں۔ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

14

اس کی آنکھ کھلی تو وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ بارش بند کھڑکیوں پر تھپیڑے لگا رہی تھی اور اس کا

سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جیسا کہ اس شہر کا معمول تھا، اس وقت ہوا کے جھکڑ کے ساتھ ساتھ بجلی چلی گئی تھی اور کمرہ قبر کی طرح ٹھنڈا اور تاریک پڑا تھا۔ اس نے محسوس کیا، اندھیرے میں اس کا دم گھٹنے لگا ہے۔ مگر وہ اس لائق نہیں تھی کہ بستر سے اٹھ کر لالٹین کے لیے باورچی خانے تک جا سکے۔ تبھی اسے ایک آہٹ سنائی دی۔ اس کا شوہر ایک موٹی سی سبز رنگ کی موم بتی مٹھی میں تھامے ہوئے اندر داخل ہو رہا تھا۔ موم بتی کی لو کافی تیز تھی۔ اس کا موم تیزی سے پگھل کر اس کی انگلیوں کے پوروں پر بہتے ہوئے زمین پر گر رہا تھا مگر اس کے چہرے پر تکلیف کے کوئی آثار نہ تھے۔

''تمھیں اندھیرے سے ڈر لگ رہا ہوگا۔'' اس نے موم کے قطرے طاق پر ٹپکائے اور ان پر بتی کھڑی کر کے اپنی انگلیوں کے پوروں سے موم کی پپڑیاں چھڑانے لگا۔ وہ رہ رہ کر ہتھیلی کی پشت کو قمیض پر رگڑتا جا رہا تھا۔ ہاتھ صاف کرنے کے بعد وہ صالحہ کے بستر پر آیا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیوں کی مدد سے کنگھی کرنے لگا۔ وہ پیار بھری نظروں سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ ''یہ تمھارا پہلا بچہ نہیں ہے کہ تم اتنی پریشان ہو رہی ہو۔ اس سے پہلے تم نے دو دو بچے ایک ساتھ پیدا کیے ہیں۔''

''وہ آ رہی ہے نا؟'' صالحہ نے ملتجیانہ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی ابھی باہر سے لوٹا تھا اور اس کے کپڑے بری طرح بھیگے ہوئے تھے۔ ''لگ رہا ہے، میرا پانی باہر آ گیا ہے۔ اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا ہے۔ تم کپڑے بدل لو۔ بیمار پڑ جاؤ گے۔ اب تمھیں ہی مجھ کو سنبھالنا ہے۔''

''تمھیں اس اناڑی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ آ رہی ہے۔ میں نے ان ہی ہاتھوں سے سو روپے کا نوٹ اس کے پلو میں باندھا ہے۔ وہ میرے ساتھ آ جاتی مگر وہ کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے گھر میں تھی۔ کوئی پیچیدہ معاملہ تھا جسے چھوڑ کر وہ آ نہیں سکتی تھی۔ زچہ مشکل سے دس برس کی رہی ہوگی۔ میں نے اتنی کمسن لڑکی کو اس سے پہلے کبھی بچہ جنتے نہیں دیکھا ہے۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں یہ بچہ کھونا نہیں چاہتی،'' صالحہ نے ڈھارس کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''خدا کے لیے آج کی رات شراب نہ پینا۔ بچہ کبھی بھی ہو سکتا ہے۔ میں اکیلی اسے دنیا میں نہیں لا سکتی۔''

''میں نے کہا نا، یہ تمھارا پہلا بچہ نہیں جو تم اتنی پریشان ہو رہی ہو،'' اس کے شوہر نے اٹھ کر اس

کے لیے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا، جس سے پیاس نہ ہونے کے باوجود صالحہ نے اس کا دل رکھنے کے لیے ایک گھونٹ لے لیا۔ گلاس واپس رکھ کر وہ گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس گیا اور اس کی سلاخوں کو تھام کر باہر تاکنے لگا۔

"لیکن وہ وقت سے پہلے دنیا میں کیوں آنا چاہتا ہے؟ یہ اچھا شگن نہیں،" اس کی فکر میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ اس کے پیچھے صالحہ کے کراہنے کی آواز تیز ہو گئی تھی۔

"اطمینان رکھو، وہ کسی بھی وقت دکھائی دے سکتی ہے۔" اس نے گردن موڑ کر صالحہ کی طرف دلاسا دینے والے انداز میں دیکھا۔ "اور خدا کا شکر ہے اس کے پاس اپنی چھتری ہے۔ میں چھتری لے جانا بھول گیا تھا۔"

"میرا پانی باہر آ گیا ہے۔ تم جا کر دروازے پر انتظار کیوں نہیں کرتے؟ کسی دوسری دائی کا انتظام نہیں کیا جا سکتا؟" صالحہ کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسے کسی کل چین نہیں مل رہا تھا۔ اسے ایک ایک لفظ کے لیے کافی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا وجود دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہو، ایک اوپر کا حصہ جہاں اس کی رگوں میں آگ دہک رہی تھی، اور دوسرا نیچے کا حصہ جس کا تعلق اس کے بڑے سے پیٹ سے تھا جہاں درد کا جہنم دہک رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے زیادہ زور لگایا تو بچہ غلط جگہ پر چلا جائے گا۔ "کوثر سے کیوں نہیں پوچھتے، اسے کسی نئی دائی کا پتا ہوگا۔"

"اتنے طوفان میں کسی نئی دائی کو ڈھونڈ نکالنا مشکل ہوگا۔ ویسے، یقین کرو، اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہماری اپنی دائی جو ہے، آ جائے گی۔ وہ راستہ نہیں بھول سکتی۔ انھیں ہر اس گھر کے بارے میں پتا ہوتا ہے جہاں زچگی ہونے والی ہو، اور یہ پہلی بار نہیں ہے، وہ پہلے بھی اپنی ماں کے ساتھ ہمارے گھر آ چکی ہے۔" صالحہ کو دکھائی تو نہ پڑا تھا مگر اسے لگا اس کے شوہر نے مسکراتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ وہ چہرے پر ہاتھ پھیر کر بارش کے چھینٹے صاف کر رہا تھا۔ بارش کی شدت میں کمی آ گئی تھی کیونکہ گلی کے بلب کی روشنی میں بوندیں سیدھی ہو کر گرتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ مڑ کر صالحہ کے پاس آیا اور اس بار اس نے مسکرا کر ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی۔ "ٹھیک اسی طرح جس طرح ہیجڑوں کو پتا ہوتا ہے کہ کب کس کے گھر بچہ پیدا ہونے والا ہے اور اس سے پہلے کہ بچہ پیدا کرنے والے فرشتے

اپنا کام کر کے جا چکے ہوں، وہ ڈھول تاشے لے کر آ دھمکتے ہیں۔"

"میں نے تو موت کے فرشتے کے بارے میں سنا ہے، یہ تم کس فرشتے کا ذکر کر رہے ہو؟" پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر صالحہ نے مسکرانے کی کوشش کی، مگر یہ مسکراہٹ کی ایک بگڑی ہوئی شکل کہی جا سکتی تھی۔ "مجھے لگتا ہے وہ نہیں آئے گی۔ میں اس کے آنے سے پہلے ہی بچہ جن بیٹھوں گی۔ آخر میں تمھیں ہی یہ کام انجام دینا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، تمھاری تشفی کے لیے میں دروازے پر جاتا ہوں، گرچہ میرے وہاں کھڑے رہنے پر وہ پر لگا کر اڑتی ہوئی نہیں آ جائے گی۔ اور تمھیں کیا لگتا ہے، جب خدا کے حکم کے بغیر اگر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا تو کیا وہ موت کے فرشتے کی طرح بچے پیدا کرنے کے لیے فرشتے آسمان سے نہیں بھیجتے ہوں گے؟ پھر بچے کے کان میں دی جانے والی اذان کون آسمان لے کر جاتا ہوگا؟"

اور وہ داخلے کے کمرے میں صدر دروازے کے پیچھے کھڑا انتظار کرنے لگا۔ اس نے کواڑ ہلکا سا کھول دیا تھا تاکہ اندر کی روشنی گلی میں گر سکے اور دائی کو مطلوبہ گھر ڈھونڈنے میں آسانی ہو۔ اسے باہر نالے سے پانی کا شور سنائی دے رہا تھا۔ "یہ طوفانِ نوح کی علامت ہے،" اس نے صالحہ کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں کہا۔ "شاید قیامت آنے والی ہے۔"

مگر صالحہ کو اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ وہ تو درد کے جہنم میں گھری ہوئی کچھ اور ہی آوازوں کو سن رہی تھی۔ اور جبکہ وہ اس عذاب میں مبتلا تھی، اس کا شوہر راہداری میں بند دروازے کے پیچھے کھڑا پریشان ہو تو رہا تھا مگر اس کی پریشانی کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ اسے شراب کی طلب ستا رہی تھی۔ مگر موجودہ حالت میں اس کے اندر ہمت نہ تھی کہ بوتل باہر نکال کر چوری چھپے ہی سہی، ایک دو گھونٹ بھر لے۔ جب ہوا میں اتنی نمی ہو تو شراب کی باس ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ مگر وہ ایک گھونٹ تو بھر ہی سکتا تھا بلکہ دو گھونٹ بھی لے سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی بیوی سے محفوظ فاصلے پر رہے۔ وہ اسی تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا کہ گلی میں بہتے پانی میں کسی کے پیروں کی چھپ چھپ سنائی دی اور اس نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر دیکھا، ایک بہت ہی بلند قامت شخص جس کے شانے گلی میں دونوں طرف کے چھجوں کو چھو رہے تھے، برساتی کندھے پر ڈالے لالٹین اٹھائے اپنے بھاری پیروں کو پانی سے باہر نکالتے ہوئے اسی کے دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے بارش سے بچانے کے لیے لالٹین کو برساتی سے آدھا ڈھانپ رکھا

جب اسے اپنے سینے پر گرمی کا احساس ہوا۔ اس نے حیرت سے دیگچے کی طرف دیکھا جس کا پانی اتنی جلد ابل کر بھاپ چھوڑ رہا تھا۔ پانی کا دیگچہ گمچھے کی مدد سے اٹھائے ہوئے وہ کمرے میں آیا تو حکیم شمیم شخص خون اور مخاط میں لتھڑے ہوئے ایک نوزائیدہ بچے کو، جس کے ہاتھ گردن اور ٹانگیں رسی کی طرح پتلی تھیں، دونوں ہتھیلیوں سے تھامے کھڑا تھا۔ بچے کی نال اب تک صالحہ کے جسم کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔

''تم دیکھ سکتے ہو، اگر یہ زندہ بھی رہتا تو بھی زیادہ دن نہ بچتا، اسی لیے اس کا ماتم بیکار ہے۔'' حکیم شمیم شخص کی آواز آئی۔ ''اب مجھے اسے لے کر جانا پڑے گا۔ سارا کام بالکل صحیح وقت پر ہوا ہے۔ تم قینچی لائے ہو؟''

ہمیشہ کی طرح ایک تیز چیخ کے ساتھ صالحہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا، دن ہو رہا تھا، کہیں پر کسی بارش یا طوفان کا نام و نشان نہ تھا اور اس کے دونوں بچے اس کے بستر کے سامنے کھڑے حیرت سے اس کی طرف تاک رہے تھے۔

15

اس دن وہ کام پر نہیں گئی۔ وہ بچوں کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر اپنے چھوٹے بچے کی واحد تصویر کے ساتھ تھانے گئی جہاں پولیس نے رپٹ لکھنے سے انکار کر دیا۔ یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے ٹھیک طرح سے چھان بین کر لے۔ کبھی کبھار گھبراہٹ میں لوگ خواہ مخواہ کی رپٹ لکھا دیتے ہیں اور بعد میں گمشدہ ہستی کے لوٹ آنے پر قانونی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ مجبوراً سارا دن شہر کے محلوں بازاروں میں اپنے شوہر کو تلاش کرتی پھری۔ جس گلی میں وہ کام کیا کرتا تھا وہاں پر وہ کئی دن سے کام پر نہیں آیا تھا۔ اس گلی میں قطار سے کئی فرنیچر کے کارخانے تھے جن کے باہر طوائفیں کھڑی گاہکوں کا انتظار کیا کرتیں۔ تقریباً ہر گھر کے برآمدے پر خراد کا کام چل رہا تھا۔ اسے پتا چلا کہ ایسا کوئی بھی شخص نہ ہوگا جو اس کے شوہر کو پہچانتا نہ ہو، کیونکہ اس جگہ اس نے ہر شخص سے ادھار لے رکھا تھا۔ اسے دارو کے اس ٹھیکے کا علم تھا جہاں سے وہ شراب خریدا کرتا مگر وہاں پر بھی اس کا کوئی پتا نہ تھا۔ وہ ناک پر رومال دبائے کھٹرنج کے برآمدے پر کھڑی کانچ اور گرِل سے ڈھکی کھڑکی کے سامنے لوگوں کو بوتل کے لیے لائن لگاتے دیکھتی رہی۔ ٹھیکے کے باہر کھلا میدان تھا اور ایک بڑی چٹان پر چاٹ کی دکانیں اور خوانچے لگے ہوئے تھے۔ چٹان کے پیچھے دور

تک رکشے اور بیل گاڑیاں کھڑی تھیں اور چاروں طرف شرابیوں کا جمگھٹا نظر آ رہا تھا۔ انھیں اس جگہ کسی عورت کو دیکھنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ وہاں پر زیادہ دیر رک بھی نہ پائی کیونکہ کچھ شرابی طوائف سمجھ کر اس کے پاس چلے آئے تھے۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا کیونکہ آس پاس ہی جھاڑیوں کے پیچھے طوائفیں منڈلایا کرتی تھیں۔ انھوں نے دور تک اس کا پیچھا بھی کیا۔ وہ اسے جھاڑیوں کے پیچھے لے جانے کے لیے بھاؤ تاؤ کر رہے تھے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ان کے چنگل سے دور نکل آئی۔ جوے کا اڈا پولیس کے ڈر سے ہمیشہ بدلتا رہتا۔ پھر بھی وہ پبلک پارک میں، جہاں درختوں کی آڑ میں یا جھاڑیوں کے اندر اس طرح کے اڈے جما کرتے، یا ندی کے کنارے کے کھنڈروں میں، جوان جواریوں کے دائمی ٹھکانے تھے، اسے ڈھونڈتی پھری۔ اسے پتا نہ تھا ان کے علاوہ وہ اور کہاں جائے۔ کچہری کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے اس کے پھاٹک پر چائے کی ایک دکان نظر آئی جہاں ایک چھ سال کا بچہ کانچ کے گلاس دھو رہا تھا۔ اس کا مالک جو ایک کوتاہ گردن والا شخص تھا میٹھی نظروں سے بچے کی طرف تاک رہا تھا۔ بچے کو دیکھ کر صالحہ کو افسوس ہوا۔ اپنے یتیم خانے کے تجربے سے وہ اس نظر کو پہچانتی تھی جس سے چائے والا بچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے اپنے بچے یاد آ گئے جو گھر پر اکیلے تھے اور وہ گھر لوٹ آئی۔

16

یہ اس کے بچے کی گمشدگی کا تیسرا دن تھا مگر اسے اب بھی لگ رہا تھا جیسے وہ آج بھی گھر پر موجود ہو۔ اسے ہر جگہ اس کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں بلکہ کئی بار رات کے اندھیرے میں وہ چونک کر بیٹھ جاتی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کا چھوٹا بچہ پہلے کی طرح بستر پر بیٹھا اپنی بڑی بڑی لاغر آنکھوں سے اس کی طرف تاک رہا ہو۔ بچے کی گمشدگی کے بعد اس کا شوہر اپنی چارپائی چھوڑ کر اس کے ساتھ سونے لگا تھا، مگر اس کی اپنی ایک الگ دنیا تھی۔ اسے صالحہ کے احساسات کا پتا بھی نہ تھا۔

چوتھے دن صالحہ کام پر گئی تو مکان مالکن نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ''کیا تم کام چھوڑ رہی ہو؟''

''پھر ہم کھائیں گے کیا؟''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' وہ صالحہ کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''اب کہ تمھارا چھوٹا بچہ گم ہو

چکا ہے، کیا تم اپنے کام پر ٹھیک طرح سے توجہ دے سکوگی؟ دیکھو، ہم لوگوں کو پھوہڑ پن کی عادت نہیں ہے۔ تم چاہو تو کام چھوڑ سکتی ہو۔"

اس سے پہلے کہ صالحہ کوئی جواب دیتی، دروازے پر آہٹ ہوئی، اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے ایک چار سال کا دبلا پتلا بچہ اپنی رسی کی طرح پتلی ٹانگوں پر کھڑا بڑی بڑی لاغر آنکھوں سے اسی کی طرف تاک رہا تھا۔ ابھی وہ بچے کو ٹھیک طرح سے سمجھ بھی نہیں پائی تھی کہ ربڑ کی دو گیندیں لڑھکتی ہوئی آئیں جن کو دو بلیاں اپنے پنجوں سے پکڑنے کی کوشش میں خود بھی ان کے ساتھ لڑھک رہی تھیں۔ صالحہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دونوں پیروں میں کوئی جان نہ رہ گئی ہو اور وہ کسی بھی پل گر پڑے گی۔ اسے ستون کا سہارا لیتے دیکھ کر خاتونِ خانہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ میرا چھوٹا بچہ ہے۔ اور تم اسے دیکھ کر اتنی حیران کیوں ہو؟ تم اس سے مل سکتی ہو۔" اس نے اپنے بچے کا کندھا تھام کر اسے صالحہ کے سامنے پیش کیا۔ صالحہ کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ جھک کر بچے کو پیار کرے۔ وہ تو ستون سے پیٹھ ٹکائے بچے کی طرف اپنی بے جان آنکھوں سے تاک رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں،" خاتونِ خانہ بچے کا ہاتھ تھام کر اسے لے کر اس کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ "تمھارے بچے کے ساتھ جو ہوا اس کے بعد کسی دوسرے بچے کو پیار دینا تمھارے لیے مشکل ہو گا۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔ اس خلا کو دنیا کا کوئی بچہ پورا نہیں کر سکتا۔"

اس دن وہ چپ چاپ اپنا کام کرتی رہی۔ خاتونِ خانہ بچے کے کمرے میں تھی۔ ایک بار اس کے دل میں بچے کے سلسلے میں جاننے کی خواہش پیدا ہوئی، مگر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ گھر واپس گئی تو ساری رات اس بچے کی آنکھوں کو دیکھتی رہی، جیسے اس کا اپنا بچہ اس کی طرف تاک رہا ہو۔ دوسرے دن اسے بچے کو پہلی بار کھانا کھلانا پڑا جس کے منھ میں نوالہ ڈالتے وقت اس کے اندر سے دنیا جہان کا پیار امنڈ آیا۔ بچے نے بھی بہت ہی حیرت انگیز طور پر بلا چون و چرا اس کی قربت قبول کر لی تھی۔ گھر کی مالکن اپنی سلائی مشین پر بیٹھی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ بچے کے لیے اس کے اس بے جا پیار پر اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات پیدا نہ ہوئے۔ اب کہ وہ بچے سے گھل مل گئی تھی، صالحہ کے اندر تھوڑی بہت سوال کرنے کی ہمت پیدا تو ہوئی مگر پھر اس نے اپنا ارادہ ٹال دیا۔ تیسرے دن بھی سارا دن کام کرتے ہوئے وہ بچے کے معمے سے الجھی رہی، بچہ جسے اس نے تین دن قبل گھر پر دیکھا تک نہ تھا

اور آج اسے بیٹھی کھانا کھلا رہی تھی۔

"میرا بچہ پیدائش کے دن سے کمزور ہے۔ تمھیں اس کا خاص خیال رکھنا پڑے گا،" خاتونِ خانہ نے کہا۔ "وہ رات بھر سویا نہیں ہے اس لیے اسے اس کے کمرے میں لے جا کر سلا دو۔ اب تک تمھیں تو پتا چل ہی گیا ہوگا کہ بچوں کے تینوں کمروں میں سے اس کا کمرہ کون سا ہے۔ مگر اسے لوری ہرگز نہ سنانا ورنہ اسے اس کی عادت پڑ جائے گی اور کل تم کام چھوڑ کر چلی گئیں تو ہم پریشانی میں پڑ جائیں گے۔"

صالحہ نے فرمانبرداری کے ساتھ سر ہلایا، مگر جب وہ بچے کو بستر پر تھپکی دے کر سلا رہی تھی تو اس کی ہتھیلی اور آنکھوں سے اپنے گمشدہ بچے کا سارا پیار بہہ نکلا اور اسے پتا بھی نہ چلا کب اس کے اندر سے لوری کا سوتا ابل پڑا، جسے وہ آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے مالکن کے ڈر سے بالکل سرگوشی میں پھسپھساتے ہوئے گا رہی تھی۔ بچہ اپنی جگہ بیٹھا صالحہ کے گمشدہ بچے کی آنکھوں سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ ان کی آنکھوں سے بچنے کے لیے وہ رہ رہ کر اجڑے ہوئے باغ کی طرف تاکتی جاتی جس کی جھاڑیاں اور پتے دھوپ سے تمتما رہے تھے۔ بچے کے سو جانے کے بعد وہ کمرے سے باہر آئی تو اس نے کسی مجرم کی طرح خاتونِ خانہ سے آنکھ ملانے سے گریز کیا تھا جس کی آنکھیں اب بھی اسے ٹٹول رہی تھیں۔

اس دن تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ گھر پہنچی تو اپنے شوہر کو گھر پر پایا۔ وہ بچوں کو کیک کے ٹکڑے کھلا رہا تھا جو وہ ایک بیکری سے خرید کر لایا تھا۔ دونوں نے اپنے گمشدہ بچے کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ شاید انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس معاملے میں کسی طرح کی امید رکھنا فضول تھا، کہ وہ ہمیشہ کے لیے اسے کھو چکے تھے۔ صالحہ نے خود کو اپنے کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ اسے یہ سوچ کر عجیب لگ رہا تھا کہ وہ جب جب اپنے بچے کا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی اسے نہ صرف گزشتہ رات کا خواب یاد آ رہا تھا بلکہ اس کے بچے کی جگہ مالکن کے بچے کی بڑی بڑی آنکھیں دکھائی پڑ رہی تھیں۔ اسے اندر ہی اندر ندامت کا احساس ہونے لگا۔ دوسرے دن اس نے نہلانے اور کھلانے کے پورے عمل کے دوران بچے کی آنکھوں سے گریز کیا، مگر بار بار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے سینے سے لپٹا کر اس کی پیشانی اور گالوں کو بوسوں سے بھر دے۔ مالکن غور سے اس کا چہرہ پڑھ رہی تھی، مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ اس دن وہ خود بچے کو کمرے میں سلانے لے گئی۔ صالحہ نے سارا دن خاموشی سے کام کیا اور

گھر واپس آکر بستر میں چہرہ ڈبو کر دیر تک روتی رہی۔ وہ دیکھ رہی تھی، ان دنوں اس کے شوہر کے اندر ذمے داری کا شدید احساس جاگ گیا تھا۔ اس رات نہ صرف اس نے کچن کی پوری ذمے داری سنبھالی بلکہ اس نے اسے بتایا کہ اسے ڈرم کے ایک کارخانے میں رات کی دربانی کی نوکری مل گئی ہے، گرچہ یہ صرف ایک ماہ کے لیے ہی ہے جب تک دربان اپنے گاؤں سے واپس نہ آجائے جہاں وہ اپنی بیوی کی زچگی کے سلسلے میں گیا ہوا ہے۔ مگر اسے امید ہے وہ جلد کسی دوسری جگہ رات کی دربانی یا کسی اور طرح کا رات کا کام ڈھونڈ لے گا اور اس طرح دن کے وقت بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے لائق ہو جائے گا۔

''میں نے تمھارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے،'' سوتے وقت اس نے، جیسا کہ اس کی عادت تھی، اپنی بیوی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں تو پتا ہے میں بہت کم عمر میں بری صحبت میں پڑ گیا تھا۔ مگر اب تمھاری وجہ سے سدھر گیا ہوں۔''

''کیا ہم پولیس کے پاس نہیں جا سکتے؟ شاید ان کے پاس کوئی خبر ہو۔ اب تو کئی دن گزر چکے ہیں۔ وہ رپٹ ضرور لے لیں گے۔''

''پولیس،'' اس کے شوہر نے اسے پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کہا۔ ''تھو، تھو، تھو۔ پولیس جائے بھاڑ میں۔ میں اس معاملے کو اپنے طریقے سے نپٹوں گا۔''

پھر بھی صالحہ نے دوسرے دن پولیس چوکی جا کر گمشدگی کی رپٹ درج کرا دی۔

17

صالحہ کی زندگی پوری طرح معمول پر آئی نہ تھی، مگر اب وہ بچے کے سانحے کو تھوڑا بہت بھولنے لگی تھی۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ اب اسے اس خلا کے ساتھ جینا ہوگا، اسی لیے وہ چپ چاپ اپنے کام میں لگی رہتی۔ کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ وہ اپنے بچے کا ذکر تو نہیں کرتی تھی، مگر ایسا بھی نہ تھا کہ وہ اس محرومی کے ساتھ جینا سیکھ گئی تھی۔ اس کا شوہر ہر روز شام کے وقت نکل جاتا اور جب صبح کی پہلی روشنی کے ساتھ لوٹتا تو خاصا خوش مزاج دکھائی دیتا۔ ایک دن اس نے بتایا کہ کام کی جگہ اس نے کچھ نئے دوست بھی بنا لیے تھے جو اسے رات کا کام ڈھونڈنے میں مدد دے رہے ہیں۔ صالحہ نے دیکھا تھا وہ جب بھی گھر لوٹتا، نشے میں ہوتا اور اسے یہ اندیشہ کھائے جاتا کہ کہیں پھر سے وہ غلط صحبت میں نہ پڑ چکا

ہو۔ عین ممکن ہے کہ یہ خوش مزاجی اس لیے ہو کہ وہ پھر سے شراب اور جوا کے اڈے کی طرف جانے لگا ہے۔ اس نے کبھی پیسہ گھر لا کر نہیں دیا تھا۔ ایک دن اس نے اس سلسلے میں اس سے پوچھنے کی جسارت کی، پھر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ کم از کم اب وہ دن بھر گھر پر بچوں کا ٹھیک سے خیال تو رکھتا ہے۔

دھیرے دھیرے دونوں میاں بیوی کی پرانی محبت لوٹ آئی۔ ایک دن اس کے شوہر نے، جبکہ دونوں بچے اپنے کمرے میں سو چکے تھے، صالحہ کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ اس سرگوشی کو جانتی تھی جو کبھی الفاظ کی شکل نہیں لیتی تھی مگر جس کا خاتمہ بستر پر ہوتا تھا۔ لیکن اس کا شوہر جو چاہتا تھا وہ اس بستر پر ممکن نہ تھا کیونکہ وہاں اب بھی وہ اپنے بچے کو بڑی بڑی لاغر آنکھوں اپنی طرف تاکتے دیکھا کرتی تھی۔ گرچہ ان کے تین بچے پیدا ہو گئے تھے مگر ان بارہ برس کی ازدواجی زندگی میں صالحہ کے اندر کبھی اپنے شوہر کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی، اس سے قطع نظر کہ ایک فرمانبردار بیوی کی طرح ہر بار اس نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ کپڑے اتارتے ہی یتیم خانے کی وہ رات اس کی آنکھوں میں گھوم جاتی جب وہ صرف سات سال کی تھی اور اسے اچھے کپڑے پہنا کر یتیم خانے کے صدر کے بستر پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ شخص سارا سال، چاہے موسم کچھ بھی ہو، فرغل کی ٹوپی پہنے رہتا اور فرداً فرداً لڑکیوں سے اکیلے میں ملا کرتا کہ تنہائی میں جان سکے کہ ان کے ساتھ برا سلوک تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ مگر جب صالحہ کا نمبر آتا تو وہ ہمیشہ اسے اپنی گود میں بٹھا کر اسے پیار کیا کرتا۔

''تم ایک اچھی لڑکی ہو۔'' اس کی آواز عورت کی طرح سریلی تھی۔ ''بڑی ہو کر تم کیا بننا چاہو گی؟''

اسے کچھ پتا نہ تھا وہ کیا بننا چاہتی تھی۔ ان لمحوں میں اسے زیادہ تر اس کی باتیں سنائی نہ دیتی تھیں کیونکہ اس کی ساری توجہ تو اس کی ٹٹولتی ہوئی ہٹی کٹی انگلیوں تک محدود رہتی جن سے خود کو بچانے میں وہ لگی رہتی۔ اکثر اسے لگتا کہ اس رات کے واقعے میں جب وہ یتیم خانے سے بھاگ نکلی تھی، اپنے شوہر کو شریک کرے اور دل کھول کر اس کے سینے سے لگ کر روئے، مگر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک دوسری قسم کا ڈر اس کے اندر سما جاتا۔ کون جانے وہ اس معاملے کو کس طریقے سے لے۔ اس کے شوہر کو شاید اس کی مجبوری کا پتا تھا۔ یوں بھی بستر میں اب تک بچے کے پیشاب کی بدبو بسی ہوئی تھی جو اسے بھی بچے کی یاد دلایا کرتی کیونکہ بچے کی گمشدگی کے بعد صالحہ نے اب تک بستر کی چادر نہیں بدلی تھی۔ وہ

صالحہ کو تھامے ہوئے دالان کے چھوٹے سے کمرے میں لے آیا اور اس کا بلب جلا دیا جو مچھروں کی چھوڑی ہوئی آلائش کے سبب دھندلا ہو رہا تھا۔ کمرہ مہینوں سے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ دیوار سے لگے تختہ پوش پر پرانے کپڑوں کا ڈھیر تھا اور سارا کمرہ بیکار کے کاٹھ کباڑ اور بچوں کے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں سے بھرا پڑا تھا۔ ''آج ہم اس کباڑ خانے کا صحیح استعمال کریں گے،'' اس کے شوہر نے مسکراتے ہوئے آنکھ ماری اور کپڑوں کو فرش پر گرانے لگا۔ صالحہ کمرے کی گھٹن اور بدبو سے پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس نے ساڑھی کا پلّو ناک پر تھام رکھا تھا۔ ایک بار اس کا جی چاہا وہ بھاگ کر نیچے چلی جائے۔ یوں بھی اسے کب اپنے شوہر کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کرنے کی خواہش ہوتی تھی۔ شاید وہ لاشعوری طور پر اس گھٹن اور بدبو کو محسوس کر رہی تھی ورنہ یہ کمرہ تو اس کے لیے تو کوئی اجنبی جگہ نہیں تھی۔

بلب بجھا کر وہ اندھیرے میں دیر تک صالحہ کی ننگی پیٹھ پر ابھری ہوئی لکیروں کو چومتا رہا۔ جسمانی ملاپ کا عمل شروع ہوتے ہی صالحہ ہمیشہ کی طرح چیخ پڑی تھی، اس لیے نہیں کہ ہمیشہ کی طرح وہ اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ سوکھی پڑی تھی بلکہ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کا بچہ پائیتانے کھڑا اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ اس کے شوہر نے دیوار کی طرف ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبائی اور بلب روشن کر دیا۔ وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور دونوں کہنیاں بستر پر ٹکائے حیرت اور اکتاہٹ کے ساتھ صالحہ کی طرف تاک رہا تھا۔ اسے یہ اچھا نہ لگتا کہ ہر بار اس کام کا آغاز صالحہ کی چیخ سے ہو، اور گرچہ ہر بار کسی نہ کسی طرح وہ اپنی شہوانی خواہش پوری کر لیتا اور جان لیوا تکلیف کے باوجود صالحہ ہمیشہ آخری دم تک اس کا ساتھ دیا کرتی، مگر آج اس کے چیخنے کا انداز بالکل جدا تھا۔ آخر وہ اس سے کیا چاہتی تھی؟ کیا وہ اس کے ساتھ جسمانی تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دے؟

''یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟'' وہ صالحہ کی آنکھوں سے جھانکتے خوف کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میرا بچہ، وہ بالکل سامنے کھڑا تھا۔''

''میرے خدا، کیا اب ہم ساری زندگی اس بچے کے ساتھ جییں گے؟''

''میں اسے بھول نہیں پاتی۔''

''نہیں، یہ بات نہیں ہے، تم ہمیشہ ایک ٹھنڈی عورت رہی ہو،'' وہ تختہ پوش سے اتر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا عضوِ تناسل دونوں ٹانگوں کے بیچ کسی مرے ہوئے چوہے کی طرح لٹک رہا تھا۔ اس کی شہوانی

خواہش دم توڑ چکی تھی۔ ''مگر آج تو تم نے حد پار کر دی۔ کیا مجھ سے دلچسپی اب بالکل ختم ہو گئی ہے؟''

صالحہ کو اپنی زیادتی کا پتا تھا۔ مگر وہ کیا کرے، وہ بھی مجبور تھی۔

''میں اپنے بچے کو ابھی تک بھول نہیں پائی ہوں۔''

''وہ مرا نہیں ہے، اسی آسمان کے نیچے کہیں پر جی رہا ہوگا۔ کیا ہم لوگ اب اس کے لیے زندہ رہنا چھوڑ دیں؟'' ہمیشہ کی طرح اس کا شوہر ایک بار پھر ایک بے پروا انسان نظر آ رہا تھا۔ کچھ ہی پل گزرے ہوں گے جب صالحہ نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچا۔ اور گرچہ صالحہ کو ہر حال میں اذیت کے سمندر سے گزرنا تھا، اس نے ایک فرمانبردار بیوی کی طرح شوہر کو پوری طرح تعاون دینے کی کوشش کی، مگر وہ خدا سے دعا بھی مانگ رہی تھی کہ وہ جلد سے جلد اپنا کام ختم کر لے۔ اس نے محسوس کیا، اس کا شوہر اب اس قابل نہ تھا کہ اپنی خواہش پوری کر سکے، وہ اپنے جنون میں بیکار کی کوشش کیے جا رہا تھا۔ آخر کار تھک کر وہ اس سے الگ ہو گیا۔ ''عین وقت پر تم ہمیشہ لکڑی کی طرح سخت بن جاتی ہو۔'' پسینے میں ڈوبا ہوا وہ غصے کی حالت میں اس کی طرف تاک رہا تھا۔ ''کیا تمھیں نہیں پتا ہم مردوں کو کیا چاہیے؟ تمھیں نہیں لگتا تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو صالحہ؟''

''میرا بچہ...''

''بھول جاؤ اسے۔ یہ تمھارے وہم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے،'' وہ لنگی کمر پر باندھ رہا تھا۔ صالحہ کو اپنی طرف تاکتے دیکھ کر اچانک اس کے شوہر کے چہرے پر ایک مسکراہٹ جاگ اٹھی۔ ''شاید تم نے واقعی کوئی پرچھائیں دیکھی ہے۔'' بنیان پہنتے ہوئے وہ طنز بھری نظروں سے کمرے میں چاروں طرف تاک رہا تھا۔ ''میں بتاؤں تم نے کیا چیز دیکھی ہے؟ تم نے ایک عورت دیکھی ہوگی جو ہم سے پہلے اس گھر پر رہا کرتی تھی جس سے تمھارا منھ بولا باپ ملنے آیا کرتا تھا۔ تمھیں شاید یہ پتا ہو، مگر شاید یہ نہ معلوم ہو کہ ایک دن اس نے نہر میں کود کر خودکشی کر لی تھی۔ لوگ کہتے ہیں اس کے پیٹ میں بچہ تھا۔ یہ وہی بچہ ہوگا جسے تم نے دیکھا ہوگا۔''

صالحہ اس افواہ کو کئی لوگوں کے منھ سے سن چکی تھی، یہاں تک کہ ایک بار کوثر نے بھی دبے دبے لفظوں میں اس کا تذکرہ کیا تھا، مگر اسے کبھی اس کا یقین نہیں آیا تھا۔ اسے پتا تھا، اس کا شوہر اس واقعے کے سہارے اس پر اپنا غصہ نکال رہا تھا۔

''ہم اگلی بار اسے درست کرلیں گے،'' صالحہ نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی جسے اس نے جھٹک دیا۔ ''تم تو جانتے ہو مجھے دن بھر کتنا کام کرنا پڑتا ہے۔ کسی دوسری جگہ کام ملا تو میں وہاں کام چھوڑ دوں گی۔''

وہ ہمیشہ کی طرح جھوٹ بول رہی تھی، ایک ایسا جھوٹ جسے وہ ساری زندگی چلاتی آئی تھی۔ اسے پتا تھا، اس کے اس سرد جنسی رویے کا تعلق جسمانی تکان سے بالکل بھی نہ تھا، نہ ہی اس کے بچّے سے تھا۔ اگر اس کی پرچھائیں نظر نہ بھی آئی ہوتی تو بھی دونوں کے درمیان اسی طرح کے یک طرفہ جنسی تعلقات ہوتے۔

کپڑے پہن کر وہ سونے نیچے چلی گئی اور اس کا شوہر دالان پر کھڑا بوتل خالی کرتا رہا۔ وہ رہ رہ کر پاؤں پٹک رہا تھا اور پڑوس کے چھپر پر تھوک رہا تھا۔ بوتل خالی کرنے کے بعد اس نے غصے کے عالم میں اسے گلی میں اچھال دیا جو ایک بڑے سے پتھر پر گری تھی جسے بچے دن کے وقت وکٹ بنا کر کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ بوتل کے چور ہونے کی آواز سے کچھ کتے بھونکتے ہوئے اس جگہ آئے اور دیر تک ان کا کورس چلتا رہا۔

18

وہ بچے سے پوری طرح مانوس ہو چکی تھی اور دوپہر کا کھانا کھلا کر اسے قصے سنایا کرتی۔ وہ ایک اچھی قصہ گو تھی اور چونکہ اس کے زیادہ تر قصے اپنی منہ بولی ماں کے منہ سے سنے ہوئے تھے، ان میں زیادہ تر گاؤں دیہات کے مناظر کے ساتھ ساتھ بھوت پریت کے واقعات بھرے ہوتے۔ ظاہر تھا، بچہ انھیں بہت ہی دلچسپی سے سنا کرتا۔ اکثر خاتونِ خانہ بھی آکر بستر پر بیٹھ جاتی اور کسی طرح کی مداخلت کیے بغیر اس کی کہانی سنا کرتی۔

''ان کہانیوں سے پتا چلتا ہے تمھیں اپنا گھر بہت عزیز تھا،'' ایک دن اس نے کہا۔ ''میرا مطلب تمھارے منہ بولے باپ کے گھر سے ہے۔ کیا واقعی وہاں بھوت پریت رہا کرتے تھے؟''

''میں نہیں جانتی،'' صالحہ بولی۔ ''میں نے تو کبھی کوئی سایہ نہیں دیکھا۔ مگر ہم پر ہر وقت خوف طاری رہتا۔ مگر کل ملا کر ہمیں یہ ماحول پسند تھا۔''

''پھر تو تم وہاں جاتی رہتی ہوگی؟'' خاتونِ خانہ اپنے بچے کا سر سہلاتے ہوئے بولی۔ ''گاؤں میں ہمارا پشتینی گھر اب بھی ہے جس کی رکھوالی ہمارے غریب رشتے دار کرتے ہیں، مگر ہم اب وہاں نہیں جاتے، یا کسی کی موت یا شادی پر ہی جاتے ہیں۔ تم اس معاملے میں خوش نصیب ہو۔''

''اس گھر پر اب میرا کوئی حق نہیں رہا،'' صالحہ نے جواب دیا۔ ''ویسے بھی وہ لوگ میرے سگے ماں باپ تو ہیں نہیں۔ میں بھی پچھلے دو سال سے وہاں گئی نہیں ہوں، نہ انھوں نے کوئی خبر لی ہے۔''

خاتونِ خانہ اس کی طرف حیرانی سے تاک رہی تھی۔ پھر اس نے دوسری کروٹ لیتے ہوئے کہا، ''منہ بولے ماں باپ سوتیلے والدین سے بہتر ہوتے ہیں۔ تمھیں ان کی قدر کرنی چاہیے۔''

بچہ سو چکا تھا۔ باورچی خانے میں باقی کے کام نپٹاتے وقت صالحہ دیر تک خاتونِ خانہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟ اس نے تو کبھی اپنے رضائی ولدین کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کہی تھی۔ اس دن وہ گھر واپس جا رہی تھی جب اس نے ایک جگہ بلی کے تین نوزائیدہ بچوں کو دیکھا جسے محلے کے بچے گھیرے کھڑے تھے۔ ان کی ماں شاید اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ آسمان پر کئی چیل منڈلا رہے تھے۔ وہ ان تینوں بچوں کو اٹھا کر گھر لے آئی۔ اس دن آدھی رات تک وہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ مل کر بلیوں کی تیمارداری کرتی رہی۔ دو مہینے کے بعد بلیوں کو گھر پر دیکھ کر بچے بہت خوش تھے۔ خود اسے بھی اچھا لگ رہا تھا۔ مگر کیا یہ کوئی اچھا شگن تھا؟ کیا اس کے اچھے دن لوٹنے والے تھے؟ اِدھر اس کا شوہر کچھ دنوں سے لگاتار پیسے لا رہا تھا جس سے اسے ایک قسم کی فراغت کا احساس ہونے لگا تھا، گرچہ وہ ان دنوں کچھ زیادہ شراب پی کر گھر آیا کرتا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم شراب چھوڑ دو؟'' اس کا شوہر بلی کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا جب صالحہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ گرچہ آج بھی اس نے پی رکھی تھی مگر آج وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

''چھوڑ دوں گا، چھوڑ دوں گا، میرے معاملے میں تم خواہ مخواہ سر درد لے رہی ہو۔ مجھے کون سی ساری عمر شراب خانے میں گزارنی ہے۔''

دوسرے دن وہ کام پر گئی تو بہت خوش تھی۔ گھر کا پھاٹک بند تھا۔ اس پر اندر سے ایک بھاری تالا لٹک رہا تھا۔ صحنک پر لالٹین جل رہی تھی اور موٹی دم والی بلی اس کے سامنے بچھے ہوئے ایک ٹاٹ پر سو

رہی تھی۔ اس نے دربان کو کسی کام سے باہر جاتے وقت ہمیشہ پھاٹک پر اسی طرح اندر سے تالا لٹکاتے دیکھا تھا، اس لیے وہ انتظار کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں دربان تالاب کے کنارے مسجد والی گلی کے دہانے پر دکھائی دیا۔ وہ دریا کی طرف سے ایک خالی ٹوکری اٹھائے واپس آرہا تھا۔

پھاٹک کھولنے کے بعد اس نے ٹوکری اپنے گھر کی دیوار سے نکلی ہوئی لکڑی کی کیل سے لٹکا دی اور صالحہ کی طرف دیکھا۔ ''کل رات لالٹین والی بلی نے تین بچے دیے، بہت ہی خوبصورت بچے تھے، مگر افسوس وہ سارے مردہ پیدا ہوئے۔ مالک نہیں چاہتے تھے کہ بچے جاگ کر ان لاشوں کو دیکھیں۔ اسی لیے مجھے ان کو دفن کرنے کے لیے دریا کی طرف جانا پڑا۔''

بلی کے پاس جا کر صالحہ دیر تک اس کی تیمارداری کرتی رہی۔ اسے اس کے لیے افسوس ہو رہا تھا۔ بلی نے ایک بار آنکھ کھول کر اس کی طرف دیکھا بھی تھا، مگر فوراً آنکھیں موند لی تھیں۔ خاتونِ خانہ برآمدے پر کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ اوپر پہنچی تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''جو بھی ہوا، اچھا ہی ہوا، کم از کم اس بیوقوف کی جان تو بچ گئی،'' وہ بولی۔ ''تم کام ختم کر کے میرے پاس آنا، تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

کام ختم کرنے کے بعد صالحہ اس کے پاس گئی تو خاتونِ خانہ نے اسے تنخواہ کی رقم پیشگی دیتے ہوئے کہا، ''میں دو ہفتے کے لیے باہر جا رہی ہوں۔ اگلے مہینے سات کی رات کو لوٹوں گی۔ آٹھ کی صبح تم ہمیشہ کی طرح کام پر ہوگی۔ یاد رکھو، آٹھ ستمبر کی صبح، وہ بدھ کا دن ہوگا۔ تمھارے گھر پر کیلنڈر تو ہوگا؟''

''مگر بلیاں؟''

''انھیں دربان سنبھال لے گا،'' وہ بولی۔ ''تمھیں بھی تو چھٹی چاہیے۔ تم کچھ وقت اپنے بچوں کے ساتھ گزارو۔''

آٹھ تاریخ! بدھ کا دن! صالحہ دو ہفتے کی چھٹی سے کافی خوش تھی۔ ایک بار اس نے اپنے شوہر اور دونوں بچوں کے ساتھ اپنے باپ کے گھر جانے کا سوچا، مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس کے لیے اب وہاں پر کیا رکھا تھا؟ انھوں نے تو بچے کے غائب ہونے کی بھی کوئی خبر نہیں لی تھی۔ یہ دو ہفتے اس نے گھر پر ڈھیر سارے کام کیے، چھوٹے سے دالان گھر اور سیڑھی کی پوری طرح صفائی کی اور اس کے الم غلم سامانوں کو ترتیب سے سجایا۔ اس نے تختہ پوش کی جگہ بدل کر اس پر ایک دھلا دھلایا توشک بچھا دیا تاکہ

بچے پڑھائی کر سکیں۔ اس گھر میں بہت سارے سامان ایسے تھے جو ان کے آنے سے پہلے سے وہاں موجود تھے جنھیں اس نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس بار بھی ایک صاف ستھری چادر سے انھیں ڈھک دیا۔ چھٹی کے دوران اس کے شوہر کو آوارہ گردی کا موقع مل گیا تھا۔ وہ دن دن بھر غائب رہنے لگا۔ ایک دن بچوں نے اسکول سے اچھا رزلٹ لا کر دیا جس سے خوش ہو کر وہ بچوں کو سیر کرانے شہر کی طرف نکل کھڑی ہوئی، شہر جو کافی دور تک پھیل گیا تھا اور سیر سپاٹے کے لیے بہت ساری نئی جگہیں بن گئی تھیں۔ اب گھر پر وہ اکیلی بیٹھی اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتی۔ بلی کے بچوں کی وجہ سے گھر پہلے کی طرح ویران نظر نہیں آتا تھا۔ یہی نہیں، بچوں کے اچھے رزلٹ نے اس کے اندر نئی امیدیں جگا دی تھیں۔ اس کے بچے شرارتی تو تھے، مگر کند ذہن نہیں تھے۔ وہ زندگی میں کچھ نہ کچھ کر دکھائیں گے۔ وہ شادمانی، تکان اور غنودگی کی حالت میں وقت گزار رہی تھی، مگر موجودہ زندگی سے ناخوش نہیں تھی۔ دیکھتے دیکھتے دو ہفتے گزر گئے، مگر ان دو ہفتوں کے آرام نے اس کے اندر ایک طرح کی تازگی بھر دی اور وہ دنیا کو نئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ جس دن اسے کام پر جانا تھا اس کے دو دن پہلے محلے میں دو گھروں کے درمیان آپسی تنازع نے گروہی تصادم کی شکل اختیار کر لی۔ کئی لوگ مارے گئے اور پولیس بڑی تعداد میں محلے کے اندر پہنچ گئی۔ وہ دالان پر کھڑی سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ آج گھر سے باہر قدم نکالنا دانشمندی کا کام نہ تھا۔ محلے کے بہت سارے لوگوں کو پولیس اٹھا کر لے گئی تھی۔ خیر سے اس کا شوہر صبح سے غائب تھا اور اس واقعے کے وقت وہاں پر اسے کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کا شوہر رات کو دیر سے بہت ہی بدمزاجی کی حالت میں گھر لوٹا۔ اسے محلے کے واقعے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور چادر سے چہرہ ڈھک کر گہری نیند سو گیا۔ صالحہ اس کے بستر پر بیٹھی دیر تک اس کے چہرے کی طرف تاکتی رہی۔ اس کے اندر اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ تھی۔

دوسرے دن معمول کے مطابق وہ سورج نکلنے سے قبل جاگ گئی۔ آج اس نے بچوں کو اسکول نہیں بھیجا۔ محلے میں اب تک تناؤ کا ماحول تھا۔ کون جانے آج پھر کوئی فساد ہو جائے۔ سورج آسمان پر آ چکا تھا جب اس نے دالان گھر کی چھت پر چڑھ کر گلی میں لوگوں کو آتے جاتے دیکھا۔ آج بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا کہ ایک دن پہلے اسی محلے میں اتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ تیسرے دن اس نے گھر کا کام ختم کیا اور شوہر کو بستر پر سوتا چھوڑ کر کام پر نکل کھڑی ہوئی۔ دربان نے اسے دیکھ کر پھاٹک کھول دیا تھا۔ انھیں

محلے میں ہونے والے فساد کے بارے میں پتا چل گیا تھا اور وہ لوگ اتنی جلد اس کے آنے کی امید نہیں کر رہے تھے۔ وہ ہر روز کی طرح دونوں طرف کے برآمدے پر پونچھا لگا کر باہر کے آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی جب اس کی نظر دالان پر چلی گئی جہاں ایک شخص ستون پر ہاتھ رکھے دانتوں پر برش کر رہا تھا۔ صالحہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے گھر کی دیواریں ہل گئی ہوں۔ جھاڑو اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس کے دونوں پیر برف کی طرح منجمد ہو گئے تھے۔ وہ شخص اسے دیکھ کر مسکرایا اور نیچے چلا آیا۔ وہ لانبے قد کا چونتیس برس کا ایک وجیہہ شخص تھا جس کی بھنویں جڑی ہوئی تھیں اور چہرے سے ایک اطمینان بخش خوشنودگی ٹپک رہی تھی۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھا جس کے سنہری فیتوں والے حاشیے اس کی بالوں سے ڈھکی ہوئی پنڈلیوں پر جھول رہے تھے۔ دیر سے جاگنے کے سبب اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے، یا شاید اسے بھی اس کے شوہر کی طرح مے نوشی کا شوق ہو، کیونکہ اس کی دونوں آنکھوں کے نیچے تھیلیاں لٹک رہی تھی جو اس کے چہرے پر بری نہیں لگ رہی تھی۔

''تو تم ہی صالحہ ہو،'' اس نے آنگن میں لگے بیسن میں منہ میں جما ہوا جھاگ اگل کر نل کا پانی گراتے ہوئے کہا۔ ''اگر کسی دوسری جگہ ہماری ملاقات ہوتی تو میں تو دھوکا کھا گیا ہوتا۔ ویسے اس گھر میں تمھاری بہت تعریفیں سنی جاتی ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا ہے تم نے دسویں کے امتحان کی تیاری کر لی تھی مگر اس سے پہلے ہی تمھاری شادی کر دی گئی۔ کیا یہ سچ ہے؟'' صالحہ کو اثبات میں سر ہلاتے دیکھ کر وہ برش کرتے ہوئے دالان کی طرف لوٹ گیا۔ اس نے غور نہیں کیا تھا کہ اسے دیکھ کر صالحہ کا چہرہ کتنا زرد پڑ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی آنکھیں بند کیے تھر تھر کانپ رہی تھی جب مالکن برآمدے پر نکل آئی۔

''اچانک تم اتنی پریشان کیوں نظر آ رہی ہو؟'' خاتونِ خانہ نے ناخوشگواری کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ کوئی راکشس نہیں کہ تمھیں کھا جائیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم نے اپنی آنکھوں کو اتنے عجیب ڈھنگ سے بند کیوں کر رکھا ہے؟''

''مجھے گھر جانا ہوگا باجی۔'' صالحہ کو اپنے پیر نہیں مل رہے تھے۔ ''میرا سر چکرا رہا ہے۔''

صالحہ کو اپنی طرف پیٹھ موڑتے دیکھ کر اس نے اسے روک لیا۔

''تمھاری پیٹھ گیلی ہو رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہاں پر خون رسنے لگا ہے۔ تمھیں کوئی چھوت کی بیماری تو نہیں؟''

''نہیں۔'' صالحہ نے ساڑھی کا آنچل کندھوں کے اوپر کھینچ کر اپنی پیٹھ کو چھپانے کی کوشش کی۔ ''پسینہ ہوگا۔ یا شاید پونچھا لگاتے وقت پانی لگ گیا ہوگا۔''

''کمرے میں آؤ، مجھے تمھاری پیٹھ دیکھنی ہے۔ اگر تمھیں کوئی چھوت کی بیماری نکلی تو ہم تمھیں کام پر نہیں رکھ سکتے۔''

''مجھے کوئی چھوت کی بیماری نہیں۔ آپ مجھے کام پر رکھنا نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔''

''وہ بعد کی بات ہے۔ تم پہلے کمرے میں آؤ۔''

اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ دیر تک صالحہ کی ننگی پیٹھ کا معائنہ کرتی رہی جہاں چابک کے آڑے ترچھے نشانات پر خون کے ننھی قطرے جم گئے تھے جبکہ وہ برا کو سینے پر تھامے بیٹھی تھی۔ خاتونِ خانہ کا کمرہ ہمیشہ دوا سے مہکتا رہتا تھا، مگر اس وقت دوا کی مہک ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ وہ باورچی خانے سے اسٹیل کا ایک چمچ لے آئی اور نشانات کو دبا دبا کر دیکھنے لگی۔

''تمھیں درد ہو رہا ہے؟''

''بہت۔''

''صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ چابک کے نشان ہیں۔ یہ تمھارے جسم پر کیسے آ گئے؟''

صالحہ ایک پل کے لیے خاموش رہی۔ پھر اس نے سر جھکا لیا۔

''میں ایک دن یتیم خانے سے بھاگ نکلی تھی۔ میں اس وقت سات برس کی تھی۔ ان لوگوں نے مجھے اس کی سزا دی تھی۔''

''وہ لوگ تمھیں بھوکا رکھتے ہوں گے؟ بلاؤز پہن لو۔''

''نہیں،'' صالحہ نے دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر برا کا ہک اٹکایا اور سر جھکا کر بلاؤز کے بٹن لگانے لگی۔ ''میں اس سے آگے بتا نہیں سکتی۔ اس دن سے، جب بھی میں گھبراتی ہوں اس جگہ خون رسنے لگتا ہے۔ میں نے بہت علاج کروایا، ڈاکٹر دوا بھی دیتے ہیں، مگر کوئی فائدہ نہیں۔ باجی مجھے گھر جانا ہے۔''

''تمھیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ گئی ہوں۔'' خاتونِ خانہ خاموش کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اذیت کا نشان نظر آ رہا تھا۔ ''تم گھر واپس جا سکتی ہو۔ میں آج کچن سنبھال لوں گی۔ میرے شوہر کے ہوتے مجھے کافی مدد مل جاتی ہے۔ مگر تم جو اچانک اتنی گھبرا گئی ہو اور جس طرح

تمھارے پیر کانپ رہے ہیں، مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں بچے وچے کا معاملہ تو نہیں۔ اگر ہے تو تم مجھے بتا سکتی ہو۔ پہلے ہی تمھارے تین بچے ہو چکے ہیں جن میں سے ایک تم گنوا بھی چکی ہو۔ اگر تم اور بچہ نہیں چاہتیں تو میں ایک سرجن کو جانتی ہوں جو بہت ہی رازداری کے ساتھ بچہ گرانے کے لیے اچھی شہرت رکھتا ہے۔"

میرے خدا، صالحہ نے سوچا، کہیں وہ میرا ذہن بھٹکانے کے لیے تو یہ سب نہیں کہہ رہی ہے؟

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔" اور مزید کوئی کیفیت دیے بغیر صالحہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ اس دن جلد بازی میں وہ بچا ہوا کھانا بھی لینا بھول گئی بلکہ اپنی گھبراہٹ میں اس نے یہ تک غور نہیں کیا کہ صحن سے گزرتے وقت ایک کالے رنگ کا بلّا اس کا راستہ کاٹ گیا تھا۔ اور گرچہ یہ کوئی نادر واقعہ نہیں تھا، اس گھر پر بلیوں کا راستہ کاٹ جانا ایک عام بات تھی، وہ آدھا راستہ طے کر چکی تھی جب اس واقعے کو یاد کر کے اس کا دل کانپ گیا۔ ٹھیک اسی وقت اسے دور سے سرکاری کنواں نظر آیا جہاں لوگوں کا ہجوم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بجلی کے ایک کھمبے سے لپٹ کر رونے لگی۔

وہ چوراہے پر پہنچی تو وہاں پولیس کی ایک جیپ کھڑی تھی۔ پولیس والے محلے والوں کی لائی گئی کرسیوں پر بیٹھ کر کاغذات کی خانہ پُری میں لگے ہوے تھے۔ اسے ان لوگوں کے وہاں ہونے کا سبب فوری طور پر سمجھ میں آگیا کیونکہ کنویں کے صحن کے سامنے ایک چادر سے ڈھکی ہوئی چارپائی رکھی تھی جس سے ایک انسانی ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا۔ چارپائی کے نیچے خون کا ایک بڑا دھبا نظر آرہا تھا جو چارپائی سے خون چونے کے سبب بن گیا تھا۔ اسے دیکھ کر لوگوں میں سرگوشیاں تیز ہو گئیں۔ پولیس والوں نے اٹھ کر اسے گھیر لیا۔ وہ چارپائی کے قریب پہنچی تو اس کے پیر جواب دینے لگے اور اس سے پہلے کہ لاش کے چہرے سے چادر ہٹائی جاتی، صالحہ کو لٹکتا ہوا ہاتھ صاف نظر آگیا۔ وہ چارپائی کے پائے کو پکڑے پکڑے بے ہوش ہو گئی۔

پانی چھڑک کر اسے ہوش میں لایا گیا تو اس نے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ دونوں گھٹنوں کے درمیان چہرہ چھپا کر سسکیاں لیتی رہی۔ پولیس والوں نے بتایا کہ جوے کے اڈے پر اس کے شوہر نے بہت سارے لوگوں سے پیسہ ادھار لے رکھا تھا، بلکہ حال ہی میں گھر کو بھی گروی رکھ کر اپنے دستخط کی بنیاد پر ایک ٹھیکے دار سے ایک بڑی رقم کا انتظام کیا تھا جسے وہ پچھلے کئی دنوں سے شراب خانے میں اپنے

ساتھیوں پر لٹاتا آرہا تھا۔ ٹھیکے دار نے پیسہ وصول کرنے کے لیے دو مسٹنڈوں کو اس کے گھر بھیجا تھا جو یہی کام کرتے تھے۔ ان سے بحث کے دوران اس کے شوہر نے چاقو نکال لیا اور ہاتھا پائی کی افراتفری میں خود اپنے چاقو سے مارا گیا۔ اس کے بہت سارے عینی گواہ موجود تھے، جنھوں نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی تھی مگر معاملہ بہت زیادہ بگڑتے دیکھ کر اپنی حفاظت کی خاطر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ خود ایک مسٹنڈا اس کے شوہر کی چھری سے بری طرح زخمی ہو گیا تھا اور نیم مردہ حالت میں اسپتال بھیج دیا گیا تھا جہاں وہ زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہا تھا۔ دوسرا فرار تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو قاتلوں کے حق میں سیلف ڈیفنس کا کیس تو بنتا ہی تھا۔

پوسٹ مارٹم کے بعد اسے دستخط کرنے کے لیے مردہ گھر جانا پڑا۔ محلے والے اس کے شوہر کی لاش کو گھر لے آئے۔ انھوں نے آپس میں چندہ کر کے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا۔ دوسری صبح اسے ٹیلے کے دوسری طرف واقع نہر کے کنارے کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا جس کی چہار دیواری کے باہر نہر کی ڈھال پر وہ سورج ڈوبنے تک اپنے دونوں بچوں کے ساتھ بیٹھی رہی جو اپنے باپ کو دفن کر کے قبرستان سے دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر آئے تھے۔ دونوں بچے گھاس پر چپ بیٹھے نہر کے سبز پانی کی طرف تاک رہے تھے جس کے دوسری طرف ریل کی پٹریاں چمک رہی تھیں۔ وہ گھر پہنچی تو کوثر اس کی منتظر تھی۔ وہ دونوں بچوں کو لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ وہ ساری رات اندرونی برآمدے پر تنہا بیٹھی چہار دیواری کی طرف تاکتی رہی۔ چہارم کے بعد ایک ہفتے تک وہ گھر سے باہر نہ نکلی۔ دونوں بچے کوثر کے گھر سے چلے آئے تھے جنھیں وہ دن دن بھر سینے سے لپٹائے پڑی رہتی۔ پاس پڑوس سے کھانا آتا تو بچے خود ہی کھا لیتے۔ ایسی ہی ایک رات وہ نیم غنودگی کی حالت میں نیند میں چلی گئی اور اس نے اپنے شوہر کو خواب میں دیکھا، وہ ہمیشہ کی طرح اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کی طرف آرہا تھا جبکہ صالحہ بستر پر بالکل ننگی بیٹھی تھی۔ شوہر کو دیکھ کر اس نے لپک کر چادر اٹھا لی اور اپنا جسم ڈھک لیا۔

"بیکار ہے صالحہ!" وہ بہت ہی غیظ بھری نظروں سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ "تم ہمیشہ اپنی من مانی کرتی آئی ہو۔ دیکھو ان لوگوں نے تمھارے ساتھ کیا کیا ہے! انھوں نے تمھیں میرے قابل نہیں چھوڑا ہے۔ تم ساری زندگی مجھے دھوکا دیتی آئی ہو۔ اب مجھے پتا چل چکا ہے یہ نشان تمھاری پیٹھ پر کیسے آئے۔"

''یقین کرو یہ میرے پیدائشی نشان ہیں،'' صالحہ نے چادر کو اور بھی سختی سے اپنے جسم کے گرد کستے ہوئے کہا۔ ''تم ہمیشہ مجھ پر شک کرتے آئے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''تمھارا مطلب ہے یہ تمھارے نصیب میں لکھا ہوا تھا؟'' اس کے شوہر کے پیچھے سے خاتونِ خانہ کی آواز آئی۔ وہ اپنی جگہ پچھلی بار کی طرح کہنی کو ہتھیلی سے تھامے کھڑی تھی۔ ''تم کس آدمی سے یہ چھپا رہی ہو؟ یہاں کوئی نہیں جو تمھارا یقین کرے گا۔ اور اس شرابی سے تم اس کی امید مت رکھو۔ سچ یا جھوٹ، اس سے اسے کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔ تمھیں پتا ہے، ڈرم کے کارخانے میں نوکری کا واقعہ سراسر جھوٹ تھا؟ وہ سڑک کے کنارے ساری رات نشے میں دھت پڑا رہتا تھا۔''

''وہ کچھ بھی چھپا نہیں رہی ہے،'' اس کا شوہر بہت ہی خطرناک ارادے کے ساتھ خاتونِ خانہ کی طرف بڑھا تھا۔ مگر آدھے راستے پر رک کر وہ جیسے اندر سے ٹوٹ گیا۔ ''وہ سچ کہہ رہی ہے۔'' اس کی آواز بالکل دھیمی پڑ گئی تھی۔ ''میں شادی کے وقت سے ان لکیروں کو دیکھتا آ رہا ہوں۔ سارے نشان بھر جاتے ہیں مگر وہ نشان جو ہم ماں کے پیٹ سے لاتے ہیں کبھی نہیں مٹتے۔''

صالحہ کو پلنگ سے اترتے دیکھ کر خاتونِ خانہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''مگر مجھے چھت پر جانا ہے۔''

''ہاں، اسے وہاں پر سکون ملتا ہے،'' اس کے شوہر نے خاتونِ خانہ سے منمناتے ہوئے سفارش کی۔ ''میرے دونوں بچے چھوٹے تھے تو گلی میں کھیلتے وقت وہ چھت سے ان پر نظر رکھا کرتی تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا صالحہ؟''

''اس وقت بچے پکڑنے والے نہیں آتے تھے؟'' خاتونِ خانہ کی آواز میں طنز کا عنصر غالب تھا۔

''ایسا کون سا سال ہوگا جب وہ یہاں نہ آتے ہوں گے، مگر انھیں کون پہچان سکتا تھا بھلا؟ ان کے کون سے سینگ ہوا کرتے تھے؟'' صالحہ کے شوہر نے ہاتھ اوپر اٹھا کر اس معاملے کو یہیں پر روکنے کی کوشش کی۔ اس نے جیب سے ایک بوتل نکال لی اور پورے معاملے سے بیزار نظر آنے لگا۔

''ایک دو گھونٹ تم بھی لے لو صالحہ، تم میں ہمت آ جائے گی،'' اس نے بوتل کے کھلے ہوئے منھ کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''غریبوں کے لیے اس سے بڑا سہارا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ مگر تم عورتوں کو جانے کیا پاٹھ پڑھایا گیا ہے۔''

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' خاتونِ خانہ تنفر کے ساتھ صالحہ کے شوہر کی طرف تاک رہی تھی۔ ''خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں غریبوں کے لیے اب یہ آخری دوا ہی باقی رہ گئی ہے۔''

صالحہ کا شوہر خفت مٹانے کے لیے مسکرایا تھا۔

''تم نے سنا، اس نے کیا کہا؟'' بوتل زمین پر رکھ کر اس نے اپنے دونوں گھٹنے تھام لیے تھے۔ نشے میں اس کی آنکھیں بالکل چھوٹی ہو رہی تھیں۔ وہ کھیسیں نکال کر گھٹنوں پر انگلیوں سے طبلہ بجانے لگا۔ ''جانتی ہو وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے؟ کیونکہ دنیا میں اس سے اچھی بات نہیں کہی جا سکتی۔ یہ دنیا ہی اس طرح سے بنی ہے، کمزور لوگوں کو پہچانو اور انھیں برا بھلا کہو۔ میں اب بھی کہہ رہا ہوں، وہ گھر تمھارے لیے صحیح نہیں ہے، اور یہ عورت تم نہیں ہو صالحہ۔ تم ایک الگ عورت ہو، تمھارا ایک شوہر ہے جو بستر گرم رکھنا جانتا ہے اور تمھارے بچے ہیں جو دکھائی دیتے ہیں۔ اگر تم اس بی بی کے کہنے پر چلو گی تو تم اس کے جال میں پھنس جاؤ گی۔''

''تو تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میرا بھی نام صالحہ ہے؟'' خاتونِ خانہ کی تکلیف سے بھری ہوئی آواز ابھری جیسے وہ اس حقیقت کو طوعاً کرہاً قبول کر رہی ہو۔ وہ سرد مہری کے ساتھ صالحہ کی طرف تاک رہی تھی۔ ''پھر اس سے کہو، مخاطب ہوتے وقت احترام سے پیش آئے چاہے وہ تمھارا نام کیوں نہ لے رہا ہو۔''

''مجھے عورتوں کا تجربہ ہے۔'' صالحہ کا شوہر ہنسا۔ ''مجھے ان کی ہر بات کا پتا ہے، یہاں تک کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کتنی ٹھنڈی چیز ہوتی ہیں۔ لیکن ہماری کون سنتا ہے؟ اور سنے بھی کیوں، آخر ہم ٹھکرائے ہوئے لوگ جو ٹھہرے۔''

''تم پھر سے سونے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہی ہو؟'' خاتونِ خانہ اس کے شوہر کی طرف پیٹھ موڑ کر صالحہ سے مخاطب ہو گئی تھی جس نے سر تکیہ پر ڈال کر آنکھیں بند کر لی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ بند آنکھوں کے باوجود وہ خاتونِ خانہ کی ہر حرکت کو دیکھ پا رہی تھی۔ ''تمھاری سانس پھول رہی ہے؟ کل میں تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔ گھبراؤ مت، تمھارے علاج کا سارا خرچ ہم اٹھائیں گے۔''

تبھی کمرے کا بلب جل اٹھا۔ صالحہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا، خاتونِ خانہ کمرے سے غائب تھی۔ اس کا شوہر دیوار سے سر ٹکائے خراٹے لیے بغیر سو رہا تھا۔ چادر کو جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے وہ بستر

سے اٹھی اور داخلے کے کمرے میں داخل ہو کر چھت میں جانے والی سیڑھی کے سامنے ٹھہر گئی۔ وہاں پر کوئی نہ تھا۔ بچوں کے کمرے کا دروازہ اندر سے بھڑا ہوا تھا۔ اس کے دونوں بچے گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ اس نے اپنے شوہر کے پیروں کے پاس رکھی بوتل اٹھا کر ناک سے لگائی۔ بوتل میں اب بھی تھوڑی سی شراب بچی ہوئی تھی جس کی بھبک سے اسے متلی آتے آتے رہ گئی۔ اس نے بوتل اس کے گیلے پینڈے کے گول نشان پر رکھ دی اور چادر سے اپنے شوہر کو ڈھک کر اس کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔

"مجھے پتا ہے، اب تم اس نیند سے کبھی جاگنے والے نہیں،" نیند کی غنودگی میں ڈوبتے ہوئے اس نے اپنے شوہر سے کہا جس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

19

اس واقعے کو دو ہفتے گزر چکے تھے۔ پاس پڑوس کے لوگ اس کے بچوں کو لے جا کر کبھی کبھار کھانا کھلا دیتے، کبھی وہ خود کچھ پکا لیتی۔ دھیرے دھیرے اس کے گھر پر لوگوں کا آنا کم ہو گیا۔ بچے اپنے باپ کی موت کے بارے میں کبھی کوئی بات یا سوال نہیں کرتے تھے۔ امتحان کے بعد کی تعطیل چل رہی تھی۔ جلد ان کی شرارت لوٹ آئی اور صالحہ کو آخر کار ایک دن کام پر نکلنا ہی پڑا کیونکہ اچھا یا برا اس کا آخری سہارا ختم ہو چکا تھا اور اب اسے خود اپنا اور اپنے دونوں بچوں کا پیٹ بھرنا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا جہاں وہ کام کرتی تھی وہاں پر اس کی جگہ اب بھی خالی تھی یا کوئی دوسری عورت رکھ لی گئی تھی۔ ان لوگوں کو اس کی بدنصیبی کا پتا چل چکا ہوگا۔ وہ لوگ اسی کا انتظار کر رہے تھے مگر اسے دیکھ کر کسی نے کچھ نہ کہا اور وہ چپ چاپ اپنے کام سے لگ گئی۔ سارے دن اس سے کوئی سوال نہیں کیا گیا، یہاں تک کہ جب کام ختم کر کے وہ واپس جا رہی تھی تو دربان نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ شاید اس گھر میں لوگوں کو نقلی ہمدردی کی اجازت نہ تھی۔ آج دربان کی داڑھی کچھ زیادہ سفید ہو رہی تھی جیسے اس کی عمر چھلانگ لگا کر کچھ سال آگے بڑھ گئی ہو۔ اس نے اپنی بڑی آنکھ موند رکھی تھی اور چھوٹی آنکھ زمین پر ٹکی ہوئی تھی۔

اس واقعے کو ڈیڑھ ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اب وہ جب بھی نماز کے لیے کھڑی ہوتی، اپنے ان دیکھے خدا کے سامنے گڑگڑایا کرتی، اپنے دونوں بچوں کی خیریت کے لیے دعائیں مانگتی۔ کبھی کبھار آدھی

رات کو اٹھ کر وہ زار و قطار روتی اور اسی حالت میں سو جاتی۔ تو بہت جلد خدا نے اس کی سن لی۔ شہر میں ڈینگو کی وبا پھیلی اور اس کے دونوں بچوں کو ایک ساتھ بخار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا جو اترنے کا نام نہ لے رہا تھا، یہاں تک کہ انھیں سرکاری اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ گرچہ شہر میں ڈینگو سے کئی موتیں ہو چکی تھیں، خون کی جانچ ہونے پر یہ عام ملیریا کا معاملہ نکلا۔ وہ اپنے کام سے ناغہ نہیں کرنا چاہتی تھی، مگر اسے ناغہ کرنا پڑا۔ بچے جب اسپتال سے واپس آئے تو کافی کمزور ہو گئے تھے۔ اس نے تین دن تک ان کی تیمارداری کی یہاں تک کہ اس کے سارے پیسے ختم ہو گئے، مگر بچوں کی طبیعت سنبھل گئی۔ وہ انھیں اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی مگر بچوں کو کوثر کے بھروسے چھوڑ کر اسے کام پر لوٹنا پڑا۔ اس بار اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی جگہ خالی ہوگی۔ اس نے دیکھا خاتونِ خانہ بیمار پڑی ہوئی تھی اور اس کا شوہر دربان کے ساتھ مل کر گھر کا کام اور کچن سنبھال رہا تھا۔

"گھبراؤ مت، مجھے دمے کی بیماری ہے اور دمے کے مریض بہت دن تک زندہ رہتے ہیں،" خاتونِ خانہ نے اس کی طرف پہلے کی طرح سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا حملہ مہینے میں ایک آدھ بار ہو جایا کرتا ہے مگر اصلی مصیبت برسات کے موسم میں آتی ہے۔ ڈاکٹر مجھے انجکشن دے کر گیا ہے اور میرے شوہر نے آکسیجن کا خاص انتظام کر رکھا ہے۔ مگر اب مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انہیلر سے کام چل جاتا ہے۔ اس معاملے میں میں بہت ہی سخت جان ہوں۔" اپنا جملہ ختم کرنے کے بعد اس نے انہیلر کی طرف اشارہ کیا تھا جو تکیہ پر پڑا تھا۔ تکیہ کے اوپر سے بھٹکتے ہوئے صالحہ کی نظر طاق پر چلی گئی جس پر ایک بلی دونوں پنجے سامنے پھیلائے پراسرار آنکھوں سے اسی کی طرف تاک رہی تھی۔ اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے خاتونِ خانہ نے گردن موڑ کر بلی کی طرف دیکھا۔ "وہ اس کی پسندیدہ جگہ ہے۔ وہ زیادہ تر اونچی جگہوں پر گھوما کرتی ہے۔ تمھیں تو پتا ہے بلیوں کی دنیا کتنی عجیب ہوتی ہے۔"

"خدا نہ کرے کہ صالحہ کو پھر سے آکسیجن کی ضرورت پڑے،" باورچی خانے سے اس کا شوہر باہر نکل آیا تھا۔ اس نے ان دونوں کی گفتگو سن لی تھی۔ وہ ایپرن پر اپنی انگلیاں صاف کر رہا تھا۔ "اور تمھیں کام پر نہیں آنا چاہیے تھا، صالحہ۔ تمھارے گھر میں کون ہے جو تمھاری غیر حاضری میں بچوں کی دیکھ بھال کر سکے گا؟ ابھی تمھارے بچے بہت کمزور ہوں گے۔ ملیریا بہت بری بیماری ہے۔ پھر سے لوٹ آئی تو ڈاکٹروں کے کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہ جائے گا۔ میں مدد کے لیے تمھارے گھر آنے ہی والا تھا،

اور شاید کسی دن آ بھی جاؤں، مگر تم دیکھ رہی ہو صالحہ کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور ہمیں اسے لے کر اسپتال جانا پڑا جہاں سے وہ کل ہی واپس آئی ہے۔ گھبراؤ مت، ہم تمھیں کام سے نہیں نکالنے والے۔ کیا تمھیں ہم اتنے ظالم لوگ دکھائی دیتے ہیں؟''

صالحہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے دیکھ کر خاتونِ خانہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب یہ کیا ہے؟ اپنے آنسو بچا کر رکھو،'' وہ بولی۔ ''اب تمھارے پاس کوئی سہارا نہیں رہا کہ تم کمزور پڑنے کے بارے میں سوچ سکو۔ یا تو خود کو سنبھالو یا دونوں بچوں کو ساتھ لے کر نہر میں کود پڑو اور سارا قصہ ختم کرو۔'' اور اس نے تکیہ کے نیچے ہاتھ لے جا کر کچھ روپے نکالے اور صالحہ کی طرف بڑھا دیے جنھیں تھامتے وقت صالحہ خاتونِ خانہ کے ہاتھ میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ خاتونِ خانہ نے گرچہ اپنی عادت کے مطابق سرد مہری اختیار کر رکھی تھی، اس نے ہاتھ واپس کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔

20

صالحہ کے دونوں لڑکے تندرست ہو کر اسکول جانے لگے تھے جب وہ کچھ دنوں کی چھٹی کے بعد پھر سے کام پر لوٹ آئی۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ وہ اپنے زخموں کو بھولنے لگی تھی۔ کام کے دوران وہ کوشش کرتی کہ اس کا اور مالک مکان کا سامنا نہ ہو، مگر اس کی غیر موجودگی میں وہ اسی کے بارے میں سوچا کرتی، بلکہ اب وہ جب بھی اپنے مرحوم شوہر کو یاد کرتی اس کے چہرے کے پیچھے سے مالک مکان کا چہرہ جھانکتا نظر آتا۔ ایک دن جب کہ وہ کام سے لوٹ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد دالان گھر کی چھت پر کھڑی گلی میں اپنے دونوں بچوں کو محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھ رہی تھی، اسے مالک مکان دکھائی دیا جو نکڑ سے اندر آ رہا تھا۔ اس نے رک کر ایک راہگیر سے ان کے گھر کا پتا پوچھا۔ راہگیر نے، جو زیادہ تر وقت اسی کے گھر کے آس پاس منڈلایا کرتا، اس کے دالان کی طرف اشارہ کیا۔ ڈوبتا سورج بستی کے چھپروں کے اوپر سے کسی مچھیرے کی طرح اپنی آخری کرنوں کا جال سمیٹ رہا تھا۔

داخلے کے کمرے میں اتر کر اس نے صدر دروازہ کھول کر مالک مکان کا استقبال کیا۔ وہ نالے پر بنے تھڑے کے سامنے اس کے دونوں بچوں کے ساتھ کھڑا تھا۔

''مجھے یہاں دیکھ کر تمھیں حیرت نہیں ہونی چاہیے،'' اس نے کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چینی

پنکھا تھا جسے اس نے فولڈ کر رکھا تھا۔ اسے ماں کو سونپ کر بچے پھر سے کھیلنے چلے گئے۔

تھڑے پر پیر رکھ کر وہ اندر آ گیا۔ وہ سیدھے صالحہ کی آنکھوں میں تاک رہا تھا۔ ''تمھیں کیا لگتا ہے، میں اتنے دنوں تک گھر پر کس کا انتظار کر رہا تھا؟ اور میرے واپس لوٹنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟''

صالحہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ اتنا اچانک تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ ساتھ ہی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ وہ انسان نہ ہو جسے وہ گھر پر دیکھتی آئی تھی، جیسے اس کے سامنے مالک مکان کے بجائے ایک دوسرا انسان بول رہا ہو جسے وہ برسوں سے جانتی ہو۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ مالک مکان اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے کے اندر چلا آیا۔ وہ شاید اتنی دور پیدل چل کر آیا تھا کیونکہ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پتلون کے پائینچوں سے نکلے ہوئے اس کے چمڑے کے پالش کیے ہوئے جوتوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے سجے ہوئے فرنیچر اور دوسرے سامانوں کا جائزہ لیا اور انتظار کرنے لگا کہ صالحہ کچھ کہے، پھر اسے خاموش دیکھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا اور گلی میں کھیلتے بچوں کی طرف اشارہ کر کے مسکرایا۔ ''میں تمھارے بچوں کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ ان کے چہرے تم سے خاصے ملتے ہیں۔''

''اب میری زندگی میں ان کے علاوہ کون ہے؟'' صالحہ نے جواب دیا۔ اسے اس کا خیال تک نہ آیا تھا کہ وہ مالک مکان کو کرسی پیش کرے۔

''میں جب بھی کسی جگہ بچوں کو کھیلتے دیکھتا ہوں، مجھے اپنا باغ یاد آ جاتا ہے جہاں کھیلتے ہوئے میرا بچپن گزرا ہے۔ کاش ان دنوں تم اس باغ کو دیکھتیں۔ تمھیں یقین نہ آتا کہ تم ان ہی درختوں کو دیکھ رہی ہو جو آج ہمارے باغ میں اتنے مرجھائے ہوئے کھڑے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے، یہ گلی بچوں کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے، مگر بچے اپنے کھیلنے کی جگہ ڈھونڈ ہی نکالتے ہیں، اور جگہ کیسی بھی ہو، انھیں کسی طرح کی محرومی یا کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے ہمارا بچپن ہمیشہ خوشیوں بھرا ہوتا ہے۔ اگر صالحہ کی طبیعت ٹھیک رہتی تو ہم کبھی اپنے بچوں کو اپنے سے الگ نہ کرتے۔ میری زندگی کا ایک بڑا حصہ اس کا علاج کرواتے گزرا ہے۔ خیر...'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں نے سنا ہے، تمھیں ہمارا باغ بہت پسند ہے اور تم اسے پھر سے پرانے دنوں میں واپس لانا چاہتی ہو۔ کیا واقعی؟''

''بالکل!'' صالحہ نے حیران ہو کر خود کو یہ کہتے سنا۔ ''میں نے امید نہیں کی تھی کہ میرے ساتھ ایسا

ہو جائے گا۔ اس کے اندر بہت ساری برائیاں تھیں، مگر کل ملا کر وہ ایک اچھا انسان تھا اور میں اس سے پیار کرتی تھی۔"

"تم اپنے مرحوم شوہر کے بارے میں بات کر رہی ہو نا؟" مالک مکان دلچسپی سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ "تمھارا زخم ابھی ہرا ہے اسی لیے تم موضوع سے بھٹک کر اسی کا ذکر کرنے لگی ہو۔ یہ فطری ہے، ابھی تم اس کے بارے میں کسی اور طریقے سے سوچ بھی نہیں سکتیں۔ پھر بھی اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ اس نے تمھیں تین بچے دیے، جو ویسے تو پیار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی مگر ہم اسے نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ سچ کہو تو ان چیزوں سے ہمیں طاقت ملتی تو ہے۔" مالک مکان نے ایک آہ بھرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ "جسے دوسرے انداز سے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا فریب ہم خود کو ہی دیا کریں۔ یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔"

"مالکن کیوں نہیں چاہتی کہ میں اکیلی آپ کے کمرے میں نہ جاؤں؟" صالحہ نے ایک کرسی گھسیٹ کر کھڑکی کے پاس لاتے ہوئے کہا۔ اسے خود اپنے سوال کی دیدہ دلیری پر حیرت ہوئی تھی۔

"اس کا جواب میرے پاس ہے مگر میں کبھی دینا نہیں چاہوں گا۔ اور خدا کے لیے، چائے ناشتے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔" مالک مکان مسکرا رہا تھا۔ دونوں کچھ پل کے لیے خاموش رہے۔ صالحہ نے محسوس کیا، مالک مکان کا اس کے گھر آنا اچانک یا بلاوجہ نہیں تھا، مگر اس کے اندر ہمت نہ تھی کہ اس سے لگا ہوا کوئی سوال کرے، مبادا وہ خود سوال و جواب کے اس عجیب و غریب چکر میں کسی اہم جگہ پر موجود ہو۔

"شاید تم سوچتی ہو گی تمھارے ساتھ جو بھی برا واقعہ پیش آیا ہے ان کے پیچھے ہم لوگ ہیں، ہم ان چیزوں کے لیے ذمے دار ہیں،" مالک مکان نے انگوٹھی پہننے والی انگلی کا ناخن دانتوں کے بیچ رکھ کر چباتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ صالحہ کی پیش کی ہوئی کرسی کی طرف دیکھے بغیر اس پر بیٹھ گیا تھا۔ "تم میرے بارے میں کچھ اس طرح سوچتی ہو گی کہ میں نے تمھارے شوہر کو تم سے چھینا ہے۔ ان حالات میں تم صحیح بھی ہو سکتی ہو۔ جس دن اس کا قتل ہوا مجھے تمھارا اس دن کا چہرہ آج بھی یاد ہے۔ تم مجھے دیکھ کر کتنی گھبرا گئی تھیں...."

"نہیں، جلد یا کچھ دیر سے، اسے تو ہونا ہی تھا۔ اور اب جبکہ وہ واقعہ ہو چکا ہے تو مجھے لگ رہا ہے میں بہت دنوں سے اس دن سے ڈرتی آئی تھی۔ وہ ایک جائز ڈر تھا مگر اب وہ ڈر میرے اندر سے ختم ہو

چکا ہے۔ اب آپ نے میرے شوہر کے قتل کے واقعے کو اپنے ساتھ جوڑ کر دیکھا تو پھر بہت سارے واقعات کو ایک ساتھ جوڑ کر دیکھنا ہوگا جنھیں ہم شاید کبھی سمجھ نہ پائیں۔"

"تم اپنی بلیوں اور اپنے بچے کے بارے میں کہہ رہی ہو نا؟ دیکھو، میں سمجھ رہا ہوں جو تم کہہ رہی ہو۔ مگر پھر میں سوچتا ہوں، مجھے اس طرح تمھارے پاس نہیں آنا چاہیے تھا،" مالک مکان نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب اس کا کیا کیا جائے کہ میں آئے بغیر نہ رہ سکا۔"

"کیوں؟" صالحہ پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ "میں نے تو آپ کو کبھی نہیں روکا۔"

"شاید اسی لیے مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔ کبھی کبھار اپنے آپ کو روکنا ضروری ہو جاتا ہے،" مالک مکان مسکرا رہا تھا۔ صالحہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے مالک مکان اپنی مسکراہٹ کی رسی کے سہارے اس دلدل سے باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں دونوں دھنستے جا رہے تھے۔ "اور وہ تمھارا شوہر، مجھے لگتا ہے وہ قبر کے اندر سے آج بھی اس گھر کو چلا رہا ہے۔ چلا ہی نہیں رہا ہے، اس نے ایک طرح سے تمھیں ایک عورت بننے سے روک رکھا ہے، ایک عورت جو ساری زندگی خود کو کھوتی آئی تھی۔ تمھیں اس کا احساس بھی ہے؟"

"یہ سچ نہیں ہے،" صالحہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اچانک اس نے محسوس کیا اس کے اندر سے اپنے مرحوم شوہر کے لیے پیار کا سوتا ابل آیا تھا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی اور اوڑھنی کے کونے سے آنکھوں کو خشک کرنے لگی۔ مالک مکان چپ کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے آنسوؤں سے بالکل ہی متاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ "شاید آپ کو اس طرح واپس نہیں آنا چاہیے تھا، گرچہ وہ آپ کا ہی گھر ہے جہاں آپ جب بھی چاہے لوٹ سکتے ہیں۔ مگر آپ دیکھ سکتے ہیں، میں نے کیا کچھ کھو دیا ہے۔ آپ کو اس طرح لوٹ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"تو مجھے واپس چلا جانا چاہیے؟" مالک مکان نے ایک آہ بھرتے ہوئے کھڑکی کی طرف دیکھا، جیسے یہ سوال کھڑکی سے کر رہا ہو۔

"نہیں، اب آپ آ گئے ہیں تو خدا کے لیے رک جائیے،" صالحہ نے سر اٹھا کر کہا۔ "کم از کم اپنے بچوں کے لیے رک جائیے۔"

"میرے بچے، شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو،" مالک مکان بہت فکرمند نظر آ رہا تھا۔ "مگر اس کا کیا کیا جائے کہ میرا رکنا ہر بار کسی نہ کسی سانحے کو جنم دیتا ہے۔" وہ اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ "میں ہر

روز خود سے یہی سوال کرتا ہوں کہ میں کیوں لوٹ آتا ہوں، کہ میرے بستر کے ٹھنڈے پڑے رہنے میں کیا برائی ہے؟"

"شاید اب یہ آپ کے بس میں بھی نہیں ہے،" صالحہ کی آواز پر مالک مکان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے دیکھا، صالحہ کے ہونٹ بری طرح کانپ رہے تھے۔ "میرا مطلب ہے آپ واپس آنے پر مجبور ہیں۔"

"تمھیں پتا ہے صالحہ، ابھی ابھی جو تم نے کہا ہے اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔"

"یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟" صالحہ نے موضوع کو بدلنے کی کوشش کی۔

"یہ تمھارے لیے نہیں ہے، اور مجھے نہیں معلوم میں اسے لے کر یہاں کیوں چلا آیا۔" مالک مکان سر جھکا کر چینی پنکھے کو غور سے دیکھنے لگا جیسے اس پر پہلی بار اس کی نظر پڑی ہو۔ "میں اپنے سفر کے دوران ایسی بہت ساری چیزیں اکٹھی کر لیا کرتا ہوں جن کے بارے میں مجھے خود بھی پتا نہیں ہوتا کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں، اور پھر ان سے پیچھا چھڑانا میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد دونوں آگے پیچھے کمرے سے باہر نکل آئے۔ صالحہ نے صدر دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بچے باہر گلی میں کھیل رہے تھے۔ ان کی آوازیں کبھی دور اور کبھی قریب سے سنائی دے جاتیں۔

"اب میں کیا کروں؟" صالحہ نے مالک مکان کی آنکھوں سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اس اتنی بڑی دنیا میں میں بالکل اکیلی ہو گئی ہوں۔"

"تم اکیلی نہیں ہو۔" مالک مکان مسکرایا۔ "میں جانتا ہوں، مجھے تم سے یہ بات نہیں کہنی چاہیے، مگر میں آنے والے دنوں کے طوفان کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ تمھیں مضبوطی سے حالات کا سامنا کرنا ہوگا، صالحہ۔ اور بھی برے دن آنے والے ہیں، ان حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن جلد ہی حالات بدل جائیں گے۔ اور تم اکیلی نہیں ہو۔"

وہ اپنے بچوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر اس نے محسوس کیا جیسے اب اس کے سارے الفاظ چھن چکے تھے۔ عین اسی وقت گلی میں اسٹریٹ لیمپ جل اٹھا اور جیسے ماحول میں ایک دھند سی چھا گئی۔ آسمان پر اب بھی لالی چھائی ہوئی تھی مگر لکڑی کے کھمبے پر لگے بلب نے اسے کافی بدل دیا تھا۔ گلی

میں کھیلتے بچوں کو نہ آسمان کی لالی سے کوئی مطلب تھا نہ بلب کی روشنی سے انھیں کوئی فرق پڑا تھا۔ ان کے لیے شام لمبی تھی اور اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی وہ اس جگہ بہت دیر تک کھیلنے والے تھے۔ ویسے اب اپنے بچوں کے سلسلے میں صالحہ کو فکر نہیں ہوتی تھی۔ وہ بڑے ہو چکے تھے اور بچہ چرانے والوں کے لیے کسی دلچسپی کے حامل نہیں رہ گئے تھے۔ گلی میں اتر کر مالک مکان نے مڑ کر صالحہ کی طرف دیکھا جو کپاٹ کے اوپری سرے کو تھامے کھڑی تھی۔ جڑی ہوئی بھنووں کے نیچے مالک مکان کی گہری آنکھوں کی طرف تاکتے ہوئے صالحہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس سے پہلے بھی دونوں کسی دوسری دنیا میں، کسی دوسری زندگی میں یا بادلوں کے بیچ کہیں پر مل چکے ہوں۔ اس کے پیر کانپنے لگے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"اچھا یا برا، میں جو بھی ہوں، میں لوٹ آیا ہوں صالحہ،" بادلوں کے اندر سے مالک مکان کی آواز آ رہی تھی۔ صالحہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ اب بھی ایک پیر تھڑے پر ٹکائے کھڑا تھا۔ "مجھے نہیں پتا، میرے واپس لوٹنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے مگر میں خود اس سے ڈرا ہوا ہوں۔"

"مجھے بھی ان سب چیزوں میں لوٹ آنا ہے جو میں کھو چکی ہوں،" صالحہ نے سر جھکا لیا تھا۔ شاید وہ مکان مالک کی آنکھوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ "مجھے پتا نہیں کس طرح، مگر میں خدا سے یہی دعا مانگا کرتی ہوں کہ مجھے پھر سے وہ زندگی جینی نہ پڑے۔"

"خدا سے دعا مت مانگا کرو، کبھی کبھی وہ دعا سن بھی لیتا ہے۔" مالک مکان مسکرایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نکڑ کی طرف بڑھ گیا۔ صالحہ دروازے پر کھڑی اسے اس وقت تک جاتے دیکھتی رہی جب تک وہ مکانوں کی اوٹ میں نہ چلا گیا۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہی آدمی تھا جو صالحہ کے گھر کے باہر منڈلایا کرتا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا نظر سے اوجھل ہو گیا۔ وہ کمرے میں واپس آئی تو اس نے دیکھا، مالک مکان کا چینی پنکھا کرسی پر پڑا ہوا تھا جس پر ایک جاپانی عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی جس کے بال لوہے کے بکسوے کی مدد سے نفاست کے ساتھ سمیٹ کر رکھے گئے تھے۔

21

خاتونِ خانہ ابھی تک بستر پر ہی تھی مگر اس کی طبیعت دھیرے دھیرے سدھرنے لگی تھی۔ کبھی

کبھارا اپنے شوہر یا صالحہ کی مدد سے وہ باہری برآمدے تک چلی آتی اور کرسی پر بیٹھ کر پھاٹک سے گزرتے لوگوں اور گاڑیوں کی طرف تاکتی رہتی۔ گرچہ لوٹتے مانسون کے بادلوں کے ساتھ ایک بار پھر سے اس کی طبیعت بگڑنے لگی تھی مگر صالحہ کو یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی مالک مکان کو اپنی بیوی کے سرھانے بیٹھے دیکھا ہو۔ وہ دالان پر کھڑا اسگریٹ پیتا رہتا یا اپنے کمرے میں کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھا کام میں منہمک رہتا، یا پھر چھت پر ٹہلتے ہوئے دریا کی طرف تاکا کرتا۔ کبھی اگر دونوں کا سامنا ہو جاتا تو وہ مسکرا کر چہرہ پھیر لیتا۔ چونکہ کسی کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ تھی، زیادہ تر وقت یہ پتا چلانا مشکل ہوتا کہ وہ گھر پر ہے یا نہیں۔ سورج نکلنے کے ساتھ ڈرائیور معمول کے مطابق کام پر آتا، گاڑی گیراج سے نکال کر، دھو پونچھ کر پھر سے اندر کر دیتا اور دن بھر دربان کے ساتھ گپیں لڑایا کرتا۔ صالحہ نے بہت دنوں سے کار کو گھر سے باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا۔

ایک دن صالحہ نے خاتونِ خانہ سے نوکری چھوڑنے کی بات کہی تو اس نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم اس حالت میں کام کیسے چھوڑ سکتی ہو؟'' اس کی نقاہت بھری آواز ابھری۔ ''ہم تمھیں روک نہیں سکتے، مگر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم تھوڑا انتظار کر لو تا کہ میری طبیعت سدھر جائے؟ اور پھر نیا آدمی ڈھونڈنے میں تو وقت لگ ہی جاتا ہے۔ کیا تمھیں نیا کام مل گیا ہے؟''

صالحہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اسے پتا نہ تھا وہ کام چھوڑنے کے بارے میں کیوں مالکن کو بتا رہی تھی۔ وہ کسی بھی دن کام چھوڑ سکتی تھی، صرف اسے آنا بند کرنا تھا۔ مگر دن نکلتے گئے اور ایک دن اس نے دیکھا، دونوں بچوں کے دروازوں پر تالا لٹک رہا تھا۔ تو خاتونِ خانہ نے اس کے خوف کو پڑھ لیا تھا۔ اسے اپنے رویے پر افسوس ہوا مگر اسے بچوں کے بند کمروں کو دیکھ کر خوشی بھی ہو رہی تھی۔ مگر یہ خوشی زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد وہ کام پر پہنچی تو خاتونِ خانہ سخت غصے میں نظر آ رہی تھی۔

''بچوں کے کمروں پر تم نے تالا لٹکایا ہے؟''

''نہیں تو باجی، میں ایسا کیوں کرنے لگی؟ یہ آپ کا گھر ہے، میں ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''ان کی کنجی تمھارے پاس ہے؟''

''نہیں۔''

خاتونِ خانہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں کی پتلیوں سے ایک سایہ سا گزرا اور اس نے اپنا چہرہ پھیر لیا۔ صالحہ جب کمروں کی صفائی کرنے گئی تو اس نے دیکھا قفل اپنی جگہ لٹک رہے تھے۔

''باجی، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ میرا حساب کر دیں؟'' اس دن کام ختم کرنے کے بعد اس نے پھر سے التجا کی۔ اب ان بند کمروں کو دیکھ کر اسے ہول آنے لگا تھا بلکہ اسے اب خود پر حیرت ہونے لگی تھی کہ آخر وہ کیا طاقت تھی جو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس گھر پر لے آیا کرتی تھی۔

''ٹھیک ہے، جیسا تم چاہو۔ کچھ ہی دن تو رہ گئے ہیں، مہینہ ختم ہونے پر ہم حساب کر لیں گے۔'' خاتونِ خانہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہمیں اس بات کا احساس ہو چلا تھا، اسی لیے ہم نے آدمی کی تلاش شروع کر دی ہے۔ کیا تمھیں دوسرا کام مل گیا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو ابھی سے ڈھونڈنا شروع کر دو۔''

اب صالحہ کام پر آتی تو اسے اس وقت تک چین نہ ملتا جب تک وہ تشفی نہ کر لیتی کہ دروازوں پر قفل لٹک رہے ہیں۔ خاتونِ خانہ کے ساتھ اب اس کی بہت کم باتیں ہوتی تھیں۔ چاہتے ہوئے بھی ابھی اس نے کسی دوسری جگہ نوکری ڈھونڈنا شروع نہیں کیا تھا۔

22

موسم بدلنے لگا تھا۔ دن کے وقت آسمان بالکل نیلا نظر آتا جس میں مہاجر پرندے جھنڈ میں گزرتے دکھائی دیتے، مگر رات ہوتے ہی جانے کہاں سے اس قدر دھند چلی آتی کہ اس میں ہر چیز ہیولے کی شکل اختیار کر لیتی۔ مہینے کے ختم ہونے میں کچھ ہی دن رہ گئے تھے، مگر ہر دن صالحہ کے لیے کسی پہاڑ سے کم نہ ہوتا۔ آخر کار وہ آخری دن آ ہی پہنچا۔ صالحہ کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ کل وہ اپنا حساب کر کے دونوں بچوں کو لے کر منھ بولے باپ کے گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی۔ وہ ان لوگوں کے پیر پکڑ لے گی۔ اسے یقین تھا، وہاں پر ان تینوں کے لیے ضرور جگہ نکل آئے گی۔ اس دن وہ

کام پر پہنچی تو خاتونِ خانہ چارپائی سے بالکل لگ گئی تھی۔ اس کے لاغر ہاتھ سینے پر دھرے ہوئے تھے اور پیشانی پر گیلی پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ صالحہ نے اسے اٹھنے میں مدد دی۔ وہ سوالیہ نظروں سے صالحہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تو تم واقعی کام چھوڑ کر جا رہی ہو؟''

''ہاں، باجی،'' اس نے اپنی بات میں جھوٹ شامل کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر ہمیشہ کے لیے اپنے باپ کے گھر جا رہی ہوں۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ جا کر رہیں۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ بچے بہت جلد بڑے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اتنے سارے سانحات سے گزرنے پر بچوں کی سوچ بدل جاتی ہے۔ تم اکیلی انھیں سنبھال نہیں سکتیں،'' خاتونِ خانہ بولی۔ ''تو ٹھیک ہے۔ آج کا کام ختم کرلو۔ میں نے تمھارا حساب کرلیا ہے۔''

اس دن وہ خوش خوش گھر کی صفائی میں لگ گئی۔ ہمیشہ کی طرح آنگن کا کام ختم کر کے وہ دالان پر گئی تو سب سے پہلے اس کی نظر بچوں کے کمروں کی طرف گئی۔ دروازوں پر معمول کے مطابق قفل لٹک رہے تھے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور اپنا کام ختم کر کے خاتونِ خانہ کے پاس گئی۔

''تم نے میرے دونوں بچوں کو دیکھا نہیں ہے۔ وہ بہت پیارے بچے ہیں۔'' وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''بچوں کے بغیر گھر کتنا سونا لگتا ہے نا؟ یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے،'' اس کی آواز سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اسے ہوا سے آکسیجن کھینچنے میں پریشانی ہو رہی تھی۔ بچوں کے تعلق سے اس کا جملہ اپنے آپ میں صالحہ کے لیے اتنا بڑا بوجھ ثابت ہوا کہ وہ پسینے میں نہا گئی۔ اب اسے بھی سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد اس جگہ سے چلی جانا چاہتی تھی۔ اسی وقت صاحبِ خانہ کہیں سے نکل آیا اور پلنگ کے پائتانے کھڑے ہو کر تشویش بھری نظروں سے صالحہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم بہت پریشان نظر آ رہی ہو، صالحہ۔ کیا بات ہے؟ میں کچھ کر سکتا ہوں؟''

''مجھے گھر جانا ہے۔'' صالحہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے پیر بری طرح کانپ رہے تھے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا، اس کی پیٹھ پر خون رسنے لگا تھا۔ اب اسے اپنے سامنے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، نہ مالکن، نہ صاحبِ خانہ، نہ گھر۔ وہ ہوا میں

ٹٹولتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھنے لگی۔

''ٹھیک ہے، ہم تمھیں روکیں گے نہیں،'' اس کے پیچھے سے مالک مکان کی آواز آئی۔ ''کیا دربان کو میں تمھارے ساتھ کروں؟ تمھیں پیسہ چاہیے؟''

''نہیں، باجی نے حساب کر دیا ہے۔ میں پیسے بعد میں لے لوں گی۔ مجھے بس گھر جانا ہے۔''

''تم اس حالت میں اکیلی گھر نہیں جا سکتیں۔''

''اسے اکیلی جانے دو،'' خاتونِ خانہ کی آواز صالحہ کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''وہ ایک بدنصیب عورت ہے۔ ان دنوں اس کے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں ہو رہا ہے۔ تم نہیں دیکھتے اس کی پیٹھ سے خون رس رہا ہے۔ اس حالت میں کوئی بھی اسے لُوٹ سکتا ہے۔ ہم بعد میں اس کا پیسہ بھجوا دیں گے۔''

وہ گرتے پڑتے کسی اندھے کی طرح راستہ ٹٹولتے ہوئے گھر کی طرف بھاگی جا رہی تھی تاکہ جلد سے جلد بچوں کو دیکھ کر اپنے دل کو ڈھارس دے سکے، جب محلے کے لوگوں نے اسے چوراہے پر روک لیا جہاں وہ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔

''رک جاؤ صالحہ، تمھارے لیے ایک بری خبر ہے۔ دونوں مسٹنڈے پھر سے آئے تھے۔ وہ تمھارے دونوں بچوں کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے گئے ہیں،'' انھوں نے کہا۔ ''انھوں نے تمھیں یہ پیغام دینے کے لیے کہا ہے کہ اگر تمھارے شوہر کی ادھار لی ہوئی رقم سود کے ساتھ تم نے واپس نہ لوٹائی یا اپنا گھر ان کے نام نہ کیا تو وہ بچوں کو مار ڈالیں گے۔ وہ بلیوں کے تینوں بچوں کو بھی لے گئے ہیں جن کے ساتھ تمھارے لڑکے کھیل رہے تھے۔ انھیں معلوم ہو گیا ہے کہ تم کسی بڑے گھر سے آئی ہو۔ وہ گھر کے لیے اوپر سے کچھ رقم دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔''

''بڑا گھر؟'' صالحہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اب ان لوگوں کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے کہ میرے لیے کچھ کر پائیں گے۔ اور پھر میرے پاس زمین کے کاغذات بھی نہیں ہیں۔''

''یہ وہ نہیں جانتے۔ وہ بڑے کٹھور لوگ ہیں۔ یہ سچ بھی ہوگا تو بھی انھیں یقین دلانا مشکل ہوگا، یا پھر جتنی جلد ہو سکے تم کاغذات کا انتظام کرلو۔''

صالحہ کو اس رقم کے بارے میں پتا نہ تھا جو اس کے مرحوم شوہر پر ادھار تھی مگر اسے اتنا پتا تھا، وہ جو بھی ہوگی کوئی معمولی رقم نہ ہوگی کیونکہ وہ کئی مہینے سے اسے شراب خانے میں لٹاتا آ رہا تھا۔ وہ دوڑتی

دوڑتی تھانے گئی اور افسر انچارج کو اس کے بارے میں بتایا۔

''بیوقوف عورت، یہ تم نے کیا کیا، سیدھے دوڑ کر تھانے آ گئیں۔ تمھیں تھانے نہیں آنا چاہیے تھا۔'' افسر انچارج گھبرا کر اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ''بلکہ اب تک تو انھیں پتا بھی چل گیا ہوگا۔'' اس نے برآمدے میں کھڑے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان لوگوں کو دیکھ رہی ہو، ان کا اور کام کیا ہے؟''

''خدا کے لیے کچھ کیجیے۔ میرا ان دونوں بچوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔''

''ہاں ہاں، ہم ضرور کریں گے،'' افسر نے سر ہلا کر رومال سے گردن صاف کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس عورت کو پہچان چکا تھا اور اس کے چہرے سے لگ رہا تھا اسے اس سے دلی ہمدردی تھی۔ ''کیا میں نے ایسا کچھ کہا ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے؟''

وہ تھانے سے باہر آ رہی تھی جب محلے کے لوگوں نے اسے گھیر لیا۔

''تم نے دیکھا اس نے کیا کہا؟ اب وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں گے۔ یہی ان پولیس والوں کا کام ہے۔ بلکہ تم نے ان کے لیے آمدنی کا ایک نیا موقع فراہم کر دیا ہے۔''

''صالحہ، اب تمھیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' ایک شخص نے اسے مشورہ دیا۔ ''تمھیں اپنے والدین کے پاس جانا ہوگا۔ وہی تمھاری مدد کر سکتے ہیں۔''

''وہ ضرور کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالیں گے۔ یا پھر تم اپنا گھر بیچ دو۔''

صالحہ نے ان نادار لوگوں کی طرف ہمدردی سے دیکھا جنھیں اس دنیا کے بدلتے حالات کا کوئی پتا نہ تھا۔ اول تو اس کے پاس گھر کا کوئی کاغذ نہ تھا، دوسرے اسے یقین نہ تھا کہ اس کے رضاعی والدین اس حالت میں ہوں گے کہ اس کے لیے کچھ کر سکیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے بلکہ اس لیے کہ اب وہ اس کی طرف شک کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے کہ کہیں وہ ان کی زمین جائیداد پر دعویٰ نہ کر بیٹھے۔ اس کے بعد وہ لوگ راستے بھر چپ چاپ چلتے رہے۔ خود صالحہ کے اندر اتنی طاقت نہ تھی کہ مزید اس سلسلے میں ان لوگوں سے گفتگو کر پاتی۔ ان لوگوں کا مشورہ برا نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے، وہ اپنے رضاعی والدین کے پاس ہاتھ پھیلانے پہنچ جائے جنھوں نے صرف تیس میل دور رہتے ہوئے بھی کبھی ان لوگوں کی خبر نہیں لی تھی۔ اور کچھ نہیں تو شاید ترس کھا کر اس کا باپ گھر کے کاغذات اسے سونپ دے جنھیں انھوں نے اپنی تحویل میں رکھا ہوا تھا۔ اسے دے کر وہ اپنے بچوں کی گاڑھا صی تو کرا ہی سکتی تھی۔ دو

سال پہلے جب اپنے شوہر کے اکسانے پر وہ آخری بار وہاں کاغذ لینے گئی تھی تو کسی نے اس کے ساتھ سیدھے منھ بات نہیں کی تھی۔ مگر فی الحال اسے افسر انچارج پر پورا بھروسا تھا۔ وہ ایک جوان لڑکا تھا، اور پھر رومال سے گردن صاف کرتے وقت کیا وہ ایک نیک انسان نظر نہیں آ رہا تھا؟ مگر تین دن گزر گئے، پولیس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ وہ صبح شام تھانے جاتی اور مایوس لوٹ آتی۔ پیسے کے بغیر تھانے کی دیواریں تک اس سے بات کرنے پر تیار نہ تھیں۔ اس نے دیکھا، تھانے کا انچارج روز ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا اور اس کی طرف مایوسی سے تاکا کرتا۔ شاید اس کے ضمیر کے کچھ خانے اب بھی روشن تھے جہاں پر صالحہ کی تصویر نظر آیا کرتی جس نے اسے خود اپنی نظروں میں ایک مجرم بنا رکھا تھا۔ چوتھے دن وہ اپنے رضاعی والدین کے پاس جانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ندی کے کنارے ایک درخت سے اس کے دونوں بچوں کی لاشیں لٹکی ہوئی پائی گئیں۔ اس واقعے سے سارے شہر کو سانپ سونگھ گیا۔ پولیس کی نااہلی پر آوازیں اٹھنے لگیں۔ آخر کار پولیس، جسے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کی عادت تھی، سخت کاروائی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ مگر انھیں اس کی ضرورت نہیں پڑی، کیونکہ عوامی غصے سے گھبرا کر قاتلوں نے خود ہی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیا تھا اور اب وہ لوگ حوالات کے اندر سرکاری حفاظت میں اطمینان کی زندگی جی رہے تھے۔ وہ عادی مجرم تھے۔ انھیں اپنے کرتوت پر ذرا بھی افسوس نہ تھا بلکہ انھوں نے یہ بات بھی بتائی کہ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے پہلی بار تنبیہ کے طور پر بلیوں کو مار کر سرکاری کنویں کے اندر ڈال دیا تھا تاکہ اس کے مرحوم شوہر کی عقل ٹھکانے پر آ جائے، گرچہ صالحہ کے چھوٹے بچے کی گمشدگی کے بارے میں انھیں کوئی علم نہ تھا۔ شاید اسے بچہ چرانے والے ہی اٹھا کر لے گئے ہوں، جو اس کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا کیونکہ اگر وہ نہ لے جاتے تو وہ اسے بھی مار ڈالتے۔ آخر انھوں نے بھی اپنا ایک ساتھی کھویا تھا۔ یہی نہیں، اگر انھیں اپنے پیشے کی ساکھ برقرار رکھنی تھی تو یہ انتقام لازمی تھا۔

پوسٹ مارٹم کے بعد محلے والے بچوں کی لاشیں سرکاری اسپتال سے لے آئے اور دوسری صبح فجر کی اذان کے بعد انھیں دفنانے کے لیے نہر کے کنارے لے گئے۔ اس دن قبرستان میں لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ اُمڈ پڑی تھی۔ بعد میں سورج ڈوبنے تک صالحہ کے گھر کے باہر محلے والوں کا جمگھٹا رہا۔ کوثر اور محلے کی ایک دوسری عورت جسے صالحہ پہچانتی نہ تھی، رات بھر اس کے پاس بیٹھی رہی۔ دونوں جب تک اس کے ساتھ رہیں، صالحہ ایک بے جان مورتی بنی اپنے آنگن کی طرف تاکتی رہی۔ ایک دو عورتیں

اور بھی آئیں۔ وہ ان کے ہمدردی کے الفاظ توجہ سے سنتی مگر اس کے چہرے پر کسی ردِعمل کا نشان نہ تھا۔

چہارم کے دوسرے دن ابھی صبح کاذب کا وقت تھا جب صالحہ اپنی بغل سے ریکسن کی ایک تھیلی لٹکائے گھر سے باہر نکلی اور دیر تک سرکاری کنویں پر بیٹھی شہر کی طرف تاکتی رہی جہاں آخری چند بتیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ اتنے سویرے لوگ کنویں پر نہیں آتے تھے۔

23

آسمان پر سفید دھاریاں پھیلنے لگی تھیں جب تھیلی بغل سے لٹکائے، جس میں اس کے اسکارف اور بٹوے کے علاوہ واحد بھاری چیز پانی کی بوتل تھی، لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ سرکاری بس اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے محلے سے بس اسٹینڈ تک کا فاصلہ کافی لمبا تھا جو شہر کے بالکل آخری سرے پر ندی اور نہر کے سنگم پر واقع تھا۔ وہ قریب پہنچ رہی تھی، آسمان بالکل صاف ہو چکا تھا جب اسے ہاتھ سے سوٹ کیس لٹکائے یا پیٹھ پر تھیلی اٹھائے یا سوٹ کیسوں کو ان کے پہیوں پر کھینچتے ہوئے اکا دکا لوگ نظر آنے لگے۔ کبھی کوئی خالی گاڑی یا مسافروں سے لدی وین خالی سڑک کا فائدہ اٹھا کر تیزی سے گزر جاتی یا مسافر کی تلاش میں کوئی خالی رکشا اپنے کمزور پہیوں پر چرخ چوں کرتا نظر آتا۔ جن حالات میں صالحہ کے ساتھ یہ سارے سانحات پیش آئے تھے، یقیناً ان کا علم سارے شہر کو ہو چکا ہوگا۔ اسکارف سے چہرے کو دونوں طرف سے ڈھانپ کر، کسی سے نظریں ملائے بغیر، وہ چلی جا رہی تھی بلکہ اب تو اس نے لمبا فاصلہ بھی طے کر لیا تھا۔ اسے اپنی بس کی فکر نہیں تھی، اس روٹ پر ہر دو گھنٹے پر گاڑیاں چھوٹا کرتی تھیں۔ اس وقت چائے کی ایک آدھ دکانوں کے علاوہ تمام دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے جن کے سامنے کتے کھڑے ہو کر رات بھر کی کسلمندی اتارنے کے لیے اپنے بدن جھاڑ رہے تھے یا ہوٹلوں کے چولھوں سے گرائی جانے والی باسی راکھ سونگھتے پھر رہے تھے، قبل اس کے کہ گھر کے دروازوں سے رات کا باسی کھانا باہر پھینکا جائے۔ کچھ کتے دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے، اور گرچہ وہ خاموشی سے چلی جا رہی تھی، کتے اس سے خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔

''اور تمھیں کتا بننے کے لیے کس نے کہا تھا؟'' صالحہ نے تھیلی دوسری بغل میں منتقل کرتے ہوئے کسی خاص کتے کو مخاطب کیے بغیر بلند آواز سے کہا، مگر اسے پتا تھا اس کی بات کا ان کتوں پر کوئی اثر

ہونے والا نہ تھا۔ ان کتوں کے حوالے سے ہی نہیں، زندگی بھر اسے اپنی بے بسی کا احساس رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد کتوں کی دلچسپی اس سے ختم ہو گئی اور اپنی طرف صالحہ کی توجہ نہ پا کر وہ لوگ پیچھے چھوٹ گئے۔ صرف اس کے پیروں کی چاپ سن کر ایک مرگھلی کتیا، جس کی چوتھی ٹانگ سوکھ گئی تھی اور جو آنکھیں بند کیے ایک گمٹی کے پایوں کے بیچ پڑی ہوئی تھی، آنکھیں کھول کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا تعاقب کرنے لگی۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے سرکاری بس اسٹینڈ پر پہنچ گئے جس کے پھاٹک کے ستون ہر طرح کے اشتہارات سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان کے پھاٹک کے جنگلے سڑ چکے تھے۔ پھاٹک کے باہر سے پرائیویٹ بسیں چھوٹا کرتیں جہاں سرکاری بسوں کے مقابلے مسافروں کی زیادہ بھیڑ ہوا کرتی، مگر اس وقت وہاں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک ایجنٹ نہا دھو کر، پیشانی پر تلک لگائے، ایک درخت کے نیچے فولڈنگ ٹیبل پر بیٹھا مختلف بسوں کے ٹکٹ سجا رہا تھا۔

''تمھیں کوئی خاص سیٹ چاہیے،'' اس نے صالحہ کو بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، مگر وہ اپنی جگہ کھڑی رہی۔ بس اسٹینڈ پر آنے والی وہ پہلی مسافر تھی۔

''کوئی خاص پسند؟'' صالحہ کو خاموش دیکھ کر ایجنٹ نے مسکرا کر اپنی بات دہرائی۔ ابھی دن شروع نہیں ہوا تھا اور اس کا مزاج سدھرا ہوا تھا۔

''مجھے بالکل سامنے کی سیٹ چاہیے،'' صالحہ بولی۔ دو سال قبل جب وہ آخری بار بچوں کے ساتھ اپنے پوس پالک باپ کے گھر گئی تھی تو کسی نے چلتی گاڑی کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر قے کر ڈالی تھی جس کا سارا چھینٹا اس کے بدن پر آ گرا تھا۔ اس کا چھوٹا بچہ اس وقت اس کی گود میں تھا اور دونوں جڑواں بچے بغل کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے جنھیں آنچل سے ڈھک کر اس نے آلودگی سے بچا لیا تھا۔ اسے یاد تھا وہ کتنی بری حالت میں اپنے باپ کے گھر پہنچی تھی۔ وہ دوسری بار اس کھیل میں شریک نہیں ہونا چاہتی تھی۔

''پھر تو تمھیں لیڈیز سیٹ کے بجائے جنرل سیٹ پر بیٹھنا پڑے گا۔ کیا تم پاس ہی کہیں رہتی ہو؟'' ایجنٹ ٹکٹ کاٹتے ہوئے اس کی طرف دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ مردوں کے لیے ایک تنہا عورت ہمیشہ دلچسپی کا سامان ہوتی ہے، جسے صالحہ بھی جانتی تھی۔ ''مجھے لگتا ہے میں نے تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ ویسے تم بہت پہلے چلی آئی ہو، اس لیے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''میرا نام صالحہ ہے اور میں ہی وہ عورت ہوں جس کے دونوں بچوں کو جان سے مار کر پیڑ سے لٹکا

دیا گیا تھا۔ کیا اتنی معلومات سے کام چل جائے گا؟'' صالحہ میز پر پیسے گنتے ہوئے بولی۔ اس نے ایجنٹ کی آنکھوں سے ٹپکتی گرسنگی کو پڑھ لیا تھا اور اپنا جملہ ختم کرنے کے بعد اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے سر سے ایک بوجھ ہٹ گیا ہو۔ ''پچھلی بار ایک مسافر نے کھڑکی سے سر نکال کرتے کردی تھی۔ کیا تمھیں یقین ہے اس بار ایسا کچھ نہ ہوگا؟''

''اچھا تو تم اس لیے سامنے بیٹھنا چاہتی ہو؟'' ایجنٹ سنجیدہ ہوگیا اور صالحہ کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے بے چین نظر آنے لگا۔ صالحہ کو اپنے رویے کے لیے افسوس ہوا۔ وہ بھی آخر انسان تھا، کمزوریوں کا پتلا۔ ''اطمینان رکھو بہن، میں نے تمھیں بالکل ڈرائیور کے پاس والی سیٹ کے پیچھے کی سیٹ دی ہے۔ تم سارا راستہ باہر کے مناظر سے لطف اٹھا سکوگی۔ سامنے کی سیٹ پہلے سے ریزرو ہے۔ اس لیے میں مجبور ہوں۔''

''نہیں،'' صالحہ نے ٹکٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''اتنی مہربانی مجھے نہیں چاہیے۔ مجھے باہر کی دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان دو برسوں میں وہاں پر کوئی پہاڑ اگ نہیں آیا ہوگا نہ ہی دریا ابل پڑے ہوں گے۔''

ٹکٹ لے کر صالحہ سڑک کے دوسرے کنارے پیپل کے ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو کر بس کا انتظار کرنے لگی۔ اس جگہ زمین پر بسوں کے کھڑے رہنے سے ان گنت گڈھے بن گئے تھے جن میں جمے ہوئے پانی میں انجن کے تیل چمک رہے تھے۔ بس اسی جگہ آکر رکنے والی تھی۔ ایک شخص چوکی پر بچوں کے لیے پلاسٹک کے کھلونے سجا رہا تھا۔ وہ انھیں پیڑ کے تنے پر لٹکا رہا تھا جس میں اس نے کیلیں ٹھونک رکھی تھیں، اور گنگناتا جا رہا تھا۔ صالحہ نے کھلونوں کی طرف تاکنے سے احتراز کیا۔ مگر پھر اس شخص کی گنگناہٹ سے اکتا کر اس جگہ سے تھوڑی دور جا کر کھڑی ہوگئی جہاں سے وہ آنے والی بسوں پر نظر رکھ سکتی تھی۔ ایجنٹ کی میز کے سامنے مسافر قطار سے کھڑے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اسی کی طرف تاک رہے تھے۔ اس نے سر جھٹک کر چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ کاش بس جلد آجائے۔ مگر بس کو آنے میں کافی وقت لگ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب سورج افق پر پوری طرح نکل چکا تھا، بس دکھائی دی مگر اس کے بعد بھی مزید آدھے گھنٹے تک کھڑی مسافروں کا انتظار کرتی رہی یہاں تک کہ سڑک کے دونوں کنارے پرائیویٹ بسوں کی قطار لگ گئی اور صالحہ کی بس کے بعد چھوٹنے والی بس کا خلاصی آکر بس کے کنڈکٹر کے ساتھ بحث کرنے لگا۔ انھیں وقت پر بس کو بھگانے کی ذمے داری دی گئی تھی تاکہ

ان کے مسافر کم نہ پڑ جائیں۔ وہ رہ رہ کر بس کی باڈی پر زور زور سے ہاتھ مار رہا تھا۔ بس کے اندر بیٹھنے کے بعد صالحہ نے اوڑھنی سے اپنا چہرہ ڈھک لیا تھا۔ اب وہ سامنے سے نظر آئے تو آئے، دونوں بازو سے لوگ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اسے وہاں کے شور و غل سے اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ یہ گاڑی روانہ کیوں نہیں ہوتی؟ وہ مزید لوگوں کی نگاہوں کا مرکز نہیں بننا چاہتی تھی۔ اسے ٹکٹ لیتے وقت ایجنٹ سے اتنی لاپروائی کے ساتھ اپنے سانحے کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لوگوں کے لیے دوسروں کے سانحات اچھی دلچسپی کا سامان ہوتے ہیں۔ یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ انسان کی اپنی زندگی میں اتنے دکھ ہیں کہ اسے ہمیشہ اپنے سے بھی زیادہ بدنصیب لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔ سورج آسمان پر آگیا تھا اور ونڈ اسکرین کا شیشہ بری طرح چمک اٹھا تھا جب ڈرائیور دروازہ کھول کر اندر آیا اور سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ سڑک پر آنے سے پہلے بس ریورس گیئر پر پیچھے ہو رہی تھی جب ایک کوتاہ گردن والا گول مٹول شخص سوٹ کیس، ہولڈ آل اور کئی بنڈلوں سے لدا پھندا، ہانپتا کانپتا نمودار ہوا تھا۔ سیٹ پر بیٹھ کر گول مٹول شخص نے رومال نکال کر اپنی گردن سے پسینہ صاف کیا، مڑ کر ایک نظر صالحہ پر ڈالی اور سر سیٹ کی پشت ٹکا کر اونگھنا شروع کردیا۔ صالحہ کے پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی، جس کے والدین پیچھے کی سیٹ پر دو اور بچیوں کو گود میں لے کر بیٹھے ہوئے تھے، بار بار صالحہ کی طرف تاک رہی تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھنے کے لیے بے چین تھی۔ آخر کار صالحہ نے جگہ بدل لی۔ اسے اپنے دونوں بچے یاد آگئے جو کھڑکی کے سامنے بیٹھنے کے لیے آپس میں لڑا کرتے تھے۔ بس کے چلنے پر ہوا تیز ہوگئی تھی۔ صالحہ نے دیکھا، بچی کو اس سے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ بار بار صالحہ کی طرف تاک رہی تھی۔ آخر کار صالحہ نے کھڑکی کے دونوں کلپ دبا کر کانچ کی سلائیڈ نیچے گرادی۔ بچی نے ممنونیت سے اس کی طرف دیکھا اور گال شیشے سے ٹکا کر باہر بھاگتے مناظر میں گم ہوگئی۔

اس کا قصبہ تیس میل دور واقع تھا جسے طے کرنے کے لیے بس کو دو گھنٹے سے زیادہ لگے۔ بیچ کی سڑک بیچ بیچ میں اس قدر ٹوٹی ہوئی تھی کہ ڈرائیور کے لیے، اس کے باوجود کہ اس روٹ پر وہ برسوں سے گاڑی چلا رہا ہوگا اور اسے راستے کے ایک ایک کنکر کا پتا ہوگا، پہیوں کو گڈھوں سے نکال پانا مشکل ہو رہا تھا۔ صالحہ کو اس راستے پر گئے ہوئے دو سال سے زیادہ ہو چکے تھے مگر دنیا کچھ زیادہ بدلی نہ تھی، سوائے اس کے کہ سڑک کے دونوں طرف کے کھیتوں میں ان گنت گھر بن گئے تھے بلکہ دریا سے گزرنے کے

بعد بھی اوبڑ کھابڑ میدانوں میں، جہاں ابھی تک بجلی کے تار تک نہیں پہنچے تھے، مکانات بننا شروع ہو گئے تھے۔ بس کچھ ہی دور گئی ہوگی جب اس نے محسوس کیا اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آخر اس نے اس سفر کا ارادہ ہی کیوں کیا؟ وہ دنیا کو کیا دکھانا چاہتی تھی؟ اسے اپنے منھ بولے باپ سے کیا امید تھی؟ اب ان سے لینے کے لیے کچھ بچا ہی کیا تھا؟ پیچھے کی طرف بھاگتے کھیتوں کی طرف تاکتے ہوئے اس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ اسے یاد آیا، اب اس دنیا میں ایسا کوئی نہیں رہا جس کے سامنے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر پائے اور اب شاید اسی طرح گھٹ گھٹ کر اسے باقی کی زندگی جینا پڑے۔ بہت ہی پراسرار طور پر وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ آخری بار تھا جب وہ اپنے منھ بولے باپ کے گھر جا رہی تھی۔ مگر اب جبکہ اسے ان لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا، وہ جانے کس موہوم امید میں اپنے پوس پالک باپ کے گھر جا رہی تھی۔ بس کے اندر زیادہ تر چھوٹے فاصلوں کے مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ جنھیں دور جانا تھا وہ باہر کے مناظر سے دلچسپی کھو چکے تھے اور آنکھیں بند کر کے کھڑکی کے بند شیشے یا سیٹ سے سر ٹکائے رات کی باقی نیند پوری کر رہے تھے جسے صبح کی پہلی بس پکڑنے کی جلدی میں انھوں نے کھو دیا تھا۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے گول متول آدمی کا چہرہ دھوپ میں تمتما رہا تھا، مگر وہ اس سے لاپروا، یکساں حالت میں اونگھ رہا تھا۔ شاید اسے بس کے آخری پڑاؤ تک جانا تھا۔ صالحہ پہلے مسافروں کی فہرست میں آتی تھی نہ دوسرے۔ مالکن کے دیے گئے سینڈلوں میں، جو جب نئے ہوں گے تو اچھی قیمت دے کر خریدے گئے ہوں گے، اسے اپنے پیروں میں بڑی راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے اندر اس کا ذہن یکسر خالی ہو گیا۔ شاید یہی وجہ تھی، جیسا کہ اس کا پوس پالک باپ بتایا کرتا تھا، کہ پرانی دنیا میں لوگ جب اپنی زندگی سے تنگ آ جایا کرتے تھے تو سیاحت پر نکل پڑتے تھے جس سے وہ ایک مکمل انسان بن کر لوٹتے تھے۔ کہیں لاشعوری طور پر اس نے اسی لیے اس سفر کا ارادہ تو نہیں کیا تھا؟ جس تناسب سے سیٹیں خالی ہو رہی تھیں اس سے زیادہ تعداد میں مسافر اندر داخل ہو رہے تھے۔ اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی اپنے والدین کے ساتھ ایک جگہ اتر گئی مگر کسی وجہ سے وہ سیٹ خالی رہی، جبکہ بس کے اندر اب بھی درجنوں مسافر چھت سے لگے پائپ یا سیٹوں کو تھامے کھڑے تھے۔ اترتے وقت بچی نے اس کی آنکھوں سے احتراز کیا تھا۔ بند شیشوں پر لگاتار دھوپ گرنے کے سبب بس کے اندر کافی گرمی ہو گئی تھی۔ اس نے شیشہ اوپر اٹھا دیا اور کھیتوں میں لگائے گئے بڑے بڑے اشتہارات کی طرف تاکنے لگی۔ پچھلی بار یہ چیزیں اس جگہ نہیں تھیں، نہ ہی اتنی

قسم کی گاڑیاں اس سے پہلے اس نے سڑک پر دیکھی تھیں۔ جلد اشتہارات ختم ہو گئے اور بس درختوں سے ڈھکی ہوئی ایک گھاٹی سے گزرنے لگی۔ اب مسافروں کو اچھا لگ رہا تھا کیونکہ اس جگہ حال ہی میں نہ صرف سڑک کی از سرِ نو تعمیر کر دی گئی تھی بلکہ بس کے اندر بھیڑ بھی کم ہو گئی تھی۔ باہر نیلے آسمان کی طرف تاکتے ہوئے صالحہ سوچ رہی تھی، کاش یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

24

اس کی آنکھ کھلی تو سورج نیلے آسمان پر تمتما رہا تھا۔ وہ اپنے پوس پالک باپ کے اجڑے ہوے باغ میں تنہا بیٹھی جھاڑیوں میں چڑیوں کو پھدکتے دیکھ رہی تھی۔ چھوٹے سے تالاب میں کنول کے ہر رنگ کے پھول کھلے ہوے تھے، جو ایک حیرت انگیز واقعہ تھا، جبکہ اس نے ہمیشہ اس میں صرف سفید کنول کھلتے دیکھا تھا۔ صالحہ شلوار کے پائینچوں سے گھاس کے میزائل نکالنے میں منہمک تھی۔ اس کی دونوں بلیاں پودوں کے سائے میں ایک دوسرے سے پنجے لڑا رہی تھیں اور جیسا کہ ان بلیوں کی عادت تھی، ان کا ارادہ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کا نہ تھا، کیونکہ انھوں نے اپنے ناخنوں کو پنجوں کے اندر کر رکھا تھا۔ آخر کار بلیوں نے آپس میں صلح کر لی اور ایک دوسرے سے سٹ کر بیٹھ گئیں۔ صالحہ اپنی شلوار سے تنکے چن چکی تھی۔ وہ گھر جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اسے اپنی ٹانگوں کے درمیان ایک عجیب چپچپاہٹ کا احساس ہوا۔ کوئی رقیق مادّہ اس کی رانوں پر بہہ رہا تھا۔ جمپر اٹھا کر اس نے دیکھا، اس کی شلوار تیزی سے بھیگتی جا رہی تھی۔ ازار بند کے اندر ہاتھ لے جا کر اس نے باہر باہر نکالا تو وہ اس کی انگلیاں خون سے لتھڑی ہوئی نظر آئیں۔ وہ چیختی چلاتی، گرتی پڑتی، گھر کی طرف بھاگی۔

ماں باہری برآمدے میں نواڑ کے پلنگ پر بیٹھی ہمیشہ کی طرح پان چبا رہی تھی۔ اس نے صالحہ کے سر پر دھول جماتے ہوئے کہا، ''ہر وقت بلیوں کے ساتھ کھیلتی رہتی ہو۔ جوان ہو رہی ہو تم۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ چلو میں تمھارے کپڑے بدل دیتی ہوں۔''

وہ اس کے پٹی باندھ کر صلوات سنا رہی تھی کہ اس نے رک کر صالحہ کے کان میں سرگوشی کی۔

''تمھاری ماں آئی ہوئی ہے پیسہ وصولنے۔ تم اس سے ملنا چاہتی ہو تو مل لو۔ آخر وہ تمھاری ماں ہے۔''

صالحہ نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ اس وقت اس نئی آفت سے وہ ویسے بھی کافی پژمردہ نظر آ رہی تھی۔ اسے کبھی اس عورت سے دلچسپی نہیں رہی تھی جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اس کی سگی ماں تھی۔ وہ اکیلی ہوئی تو دبے پاؤں برآمدے پر چلتے ہوئے ابو کے کمرے کی طرف گئی اور کھڑکی کے پردے کا کونا تھوڑا سا سرکا کر اندر دیکھا۔ کمرے کے اندرونی برآمدے کی طرف کھلنے والے دروازے پر اس کی ماں اپنے بھوتنی کی طرح ٹیڑھے میڑھے دانتوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ ابو کمرے میں نہیں تھے۔ تبھی صالحہ کو اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ ابو تھے۔

''جاؤ، جا کر کھیلو،'' انھوں نے دروازہ اپنے پیچھے بند کرتے ہوئے کہا۔ ان کے ہاتھ میں ایک پتلا سا لفافہ تھا۔ ''ہمیں ضروری کام ہے۔''

''میں کتنی بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ اس کے سامنے مت آیا کرو، وہ تمھیں پسند نہیں کرتی...''
صالحہ واپس جا رہی تھی کہ اس نے مڑ کر اپنا کان بند دروازے سے لگا دیا۔ وہ بس اتنا ہی سن پائی۔ صالحہ کو پتا تھا، وہ اس کی سگی ماں سے ہی مخاطب تھے اور کسی وجہ سے اس سے ناراض تھے۔

وہ باغ میں جا کر تالاب کے کنارے گھاس پر بیٹھ گئی اور ڈھال پر کھڑے کیلے کے کتھئی پھولوں کی طرف تاکنے لگی جن میں اچھی بہار آئی ہوئی تھی۔ ناریل کے درخت ڈاب سے لدے کھڑے تھے۔ وہ اپنی سگی ماں کے بارے میں سوچنے لگی جو آجکل ابو کے پاس پیسہ وصولنے کچھ زیادہ ہی آنے لگی تھی۔ اس نے اسے ہر بار گھر کے اندر آتے دیکھا تو تھا مگر وہ اسے کبھی گھر سے باہر جاتی نظر نہیں آئی۔ شاید پیچھے کے راستے سے اسے باہر کا راستہ دکھا دیا جاتا ہو۔ اسے پتا تھا، ابو کو اس کا آنا پسند نہ تھا مگر وہ اسے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ بس یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کا اور صالحہ کا آمنا سامنا ہو، بلکہ صالحہ خود بھی اُس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تالاب کا پانی بیچ میں کسی زخم کی پپڑی کی طرح سوکھ چکا تھا اور چاروں طرف کی کیچڑ سخت ہو کر ٹوٹے پھوٹے کھپریلوں کی طرح نظر آ رہی تھی۔ زمین کی ان چیزوں سے الگ تھلگ نیلے آسمان پر چاندی کے رنگ کے بادل بے حس و حرکت معلق تھے۔ وہ پانی تک پہنچنے کے لیے سوکھی کیچڑ میں داخل ہونے کے بارے میں سوچ رہی تھی مگر ماہواری کی پٹی بندھی ہونے کے سبب اسے تالاب میں اترنے کی ہمت نہ تھی۔ پٹی اتنی کس کر باندھی گئی تھی کہ چلتے وقت اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے پیر ہوا پر ہوں، جہاں سے وہ کسی بھی پل گر سکتی ہے۔ پھر بھی وہ شلوار کے پائینچوں کو ٹخنوں پر

اٹھائے تھوڑی دور تک چل کر گئی۔ سوکھی کیچڑ اس کے پیروں کے نیچے چور ہو رہی تھی، تلووں کو گدگدا رہی تھی۔ اسے لگا ٹانگوں کے بیچ سے اس کا خون کچھ زیادہ تیزی سے خارج ہونے لگا تھا۔ اس نے پانی میں اترنے کا ارادہ ترک کیا۔ وہ واپس لوٹ کر گھاس پر پیروں کو رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھی جب کسی کی مضبوط انگلیوں نے اس کے دونوں کندھے پکڑ لیے۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔

یہ اس کی سگی ماں تھی جو پیچھے کھڑی اپنے بھوتنی جیسے دانتوں سے ہنس رہی تھی۔

اس کی چیخ نکل گئی۔

''دیکھ میں نے تجھے ڈرا دیا نا؟ ایسی ہی ہوں میں، اور مجھے پتا ہے وہ لوگ میرے بارے میں کس طرح کی باتیں کرتے ہوں گے۔ مگر مجھے نہیں لگتا تو یہاں خوش ہے۔ تجھے نہیں لگتا، اب ان کے اپنے بچے ہو گئے ہیں۔ انھیں ان سے فرصت کب ملتی ہوگی کہ تیرے بارے میں سوچیں۔''

''میں خوش ہوں اور تم میری ماں نہیں ہو۔'' صالحہ نے اپنے کندھے چھڑانے کی کوشش کی مگر ماں کی گرفت کندھے پر اور بھی سخت ہو گئی تھی جیسے اس کی انگلیاں صرف ہڈی کی بنی ہوں۔

''پاگل ہو گئی ہے تو۔ تو اس کنجوس بوڑھے سے خوش ہے؟ تیرا دماغ خراب تو نہیں ہوا؟ تجھے پتا بھی ہے اسے یقین دلانے میں کہ تو میرا خون ہے، مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے؟''

صالحہ نے کندھے چھڑانے کی کوشش کی مگر اس کی ماں کو اس کے ارادے کی بھنک مل گئی تھی۔ اس نے اس کے دونوں بازوؤں کے گرد اپنی بانہیں کس لیں۔ اس کے اندر ایک ایسی مضبوطی اور ضد نظر آ رہی تھی جس کی صرف ایک پاگل عورت سے امید کی جا سکتی تھی۔

''مجھے پتا چلا ہے تیری ماہواری شروع ہو گئی ہے،'' اس نے اپنا چہرہ صالحہ کے داہنے کندھے سے سامنے لاتے ہوئے کہا۔ اس کے منھ کی بدبو سے صالحہ کی سانس اٹک رہی تھی۔ ''تو یہاں پر خوش نہیں ہے لڑکی، ورنہ اتنی کم عمر میں تیرے ساتھ یہ نہ ہوتا۔ تو جب یہ ہو گیا ہے اور تو جوان ہونے لگی ہے تو غیروں کے ساتھ رہنے کے بارے میں تو سوچ بھی کیسے سکتی ہے؟ وہ تیرا پوس پالک باپ ہے، اپنا خون نہیں ہے۔ تجھے ہوشیار ہو جانا چاہیے، اپنے لوگوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اور وہ تیری ماں، تجھے پتا بھی ہے وہ پھر سے پیٹ سے ہے؟ اتنے بچوں کے ہوتے کیا وہ تجھے پیار کر سکے گی؟ تو یہاں کی نہیں ہے صالحہ۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

صالحہ نے اپنی پوری قوت لگا کر ایک زور کا جھٹکا دیا اور ماں کے بازو کھل گئے۔ وہ شاید لڑکھڑا کر پیچھے گر گئی تھی۔ مڑ کر دیکھے بغیر، صالحہ تالاب کے کنارے بھاگنے لگی۔ وہ تالاب کے آخری سرے پر پہنچ چکی تھی جہاں سے گھر کا پختہ نالہ کھیتوں میں جاتا تھا جب اس نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔ تالاب کا وہ کنارہ ویران پڑا ہوا تھا۔ وہ وہاں پر تذبذب کی حالت میں کھڑی تھی جب اسے اپنے بازوؤں پر پھر سے مضبوط انگلیوں کی گرفت کا احساس ہو۔ اس نے بازوؤں کی طرف دیکھا اور دہشت کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کے دونوں بازوؤں سے ماں کے کہنی تک کٹے ہوئے ہاتھ لٹک رہے تھے۔ اس نے زور کا جھٹکا دیا اور دونوں کٹے ہوئے ہاتھ، اپنے پنجوں سمیت، اڑتے ہوئے نالے کے اندر جا گرے جن پر کئی بلیاں جانے کہاں سے نکل کر ٹوٹ پڑیں اور انھیں بھنبھوڑتے اور غراتے ہوئے کیچڑ کے اندر لے جانے لگیں۔ تبھی صالحہ کے کندھوں کو کسی نے پکڑ کر پھر سے جھنجھوڑا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

یہ کنڈکٹر تھا جو اپنا پسینے میں ڈوبا ہوا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل قریب لا کر اس کی آنکھوں کے اندر تاک رہا تھا۔

"بی بی، تم نے کوئی برا خواب دیکھا ہے۔ کیسے چیخ رہی تھیں تم!"

صالحہ نے سر گھما کر بس کے مسافروں کی طرف دیکھا۔ تمام لوگ اسی کی طرف تاک رہے تھے۔ ڈرائیور اسٹیئرنگ وہیل تھامے اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیلا آسمان ونڈ اسکرین کے شیشے پر پھسلتا ہوا اوپر کی طرف غائب ہو رہا تھا۔

25

گاڑی قصبے کے بس اسٹینڈ پر کھڑی تھی جو لوہے کے ایک شیڈ اور چند دکانوں پر مشتمل تھا۔ صالحہ نے کھڑکی کا شیشہ اوپر اٹھایا، تھیلی سے کنگھی نکالی اور اپنے بال جھاڑنے لگی۔ آگے جانے والے مسافر بس سے اتر کر کھانے پینے کی چیزیں خرید رہے تھے۔ المونیم کے بنے چند دقیانوسی رکشے بس کے دونوں دروازوں سے آ لگے تھے۔ ایک رکشا پر بیٹھ کر وہ اسٹینڈ سے باہر آئی۔ سڑک پر بہت کم لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ایک زرعی شہر تھا جہاں ہر طرف دھان اور سبزی کے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور اونچی نیچی زمینوں پر سال کے درختوں کے جھنڈ کھڑے تھے۔ راستے کے دونوں طرف نظر ڈالتے ہوئے اس نے

محسوس کیا، یہاں کی دنیا ان دو برسوں میں کچھ خاص بدلی نہ تھی۔ کیا یہاں پر لوگوں نے دوسرے چھوٹے شہروں کی طرح بڑے شہر کا راستہ نہیں دیکھا تھا؟ آسمان بے داغ نیلا تھا۔ دھوپ میں بڑی راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ قصبے میں ہر سو دو سو گز کی دوری پر چھوٹے بڑے تالاب چمک اٹھتے۔ ایک بڑے تالاب کا سبز پانی پمپ کے ذریعے نیچے کھیتوں میں بھیجا جا رہا تھا۔ کھپریل کے کچے پکے گھروں اور بجلی کے دقیانوسی کھمبوں کی طرف تاکتے ہوئے، جو اسے اس علاقے کی یاد دلاتے تھے جہاں پر یتیم خانہ تھا، اسے یہ سوچ کر عجیب لگ رہا تھا کہ پچھلی بار جب وہ یہاں پر آئی تھی تو اس کا ایک بھرا پُرا کنبہ تھا، جبکہ آج وہ دنیا میں بالکل اکیلی ہو چکی تھی۔ رکشا ریلوے کوارٹر کے پھاٹک کے سامنے رک گیا جس کے لوہے کے جنگلے ٹیڑھے ہو کر زمین میں گھس گئے تھے۔ کرایہ چکا کر اس نے تھیلی بغل سے لٹکائی اور ٹوٹے پھوٹے تین منزلہ رہائشی کھنڈروں کے درمیانی راستے پر چلنے لگی۔ پچھلی بار بھی وہ جب آئی تھی تو یہ کھنڈر اسی طرح کھڑے تھے، مگر وہ بچوں کے ساتھ رکشا پر باہر باہر گزر گئی تھی۔ کھنڈروں کے بیچ چلتے ہوئے، جہاں میدانوں میں سؤر یا گائیں چر رہی تھیں یا بچے کرکٹ کھیل رہے تھے، اس نے ایک آدھ عمارت کی بالکنی پر غلیظ کپڑے یا کمبل پسرے ہوئے دیکھے۔ برسوں سے کچھ بے زمینوں نے ان کھنڈروں کو اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ گھاس کے میدان میں بچوں کو کھیلتے دیکھ کر اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا جب وہ نئی نئی یتیم خانے سے آئی تھی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہاں کھیلنے آیا کرتی تھی۔ ان دنوں یہ کھنڈر اتنی بری حالت میں نہ تھے مگر آج کی طرح ہی خالی پڑے ہوئے تھے (ان میں اس نے کبھی لوگوں کو رہتے نہیں دیکھا تھا)۔ دوسری طرف اُن دنوں لڑکیوں پر والدین کا اتنا سخت پہرہ نہ تھا جیسا کہ آج دکھائی دیتا ہے، گرچہ اور دوسری لڑکیوں کی طرح ہی سرکاری اسکول کے ساتھ ساتھ جہاں وہ جایا کرتی، اسے مسجد کے مدرسے میں بھی ڈال دیا گیا تھا اور اس کی پوس پالک ماں گھر پر الگ سے اسے نماز سکھا رہی تھی۔ یہ مسجد ان کی اپنی تھی جس کے امام بعد میں اسے قرآن شریف کا درس دینے گھر آنے لگے۔ ان سب چیزوں کے باوجود، کئی سال تک وہ آزادی سے تالابوں، کھیتوں اور میدانوں میں کسی تتلی کی طرح منڈلاتی پھری تھی۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ آٹھ برس، وہ انھیں کیسے بھول سکتی ہے! آج اس کے پاس اپنا کہنے کے لیے اُن دنوں کے علاوہ اور کیا رہ گیا تھا۔ مگر وہ بے فکری کے دن کتنی تیزی سے گزر گئے تھے۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اچانک گھر پر اس کی شادی کا چرچا ہونے لگا اور

اسکول چھڑا کر اسے پردے میں بٹھا دیا گیا۔ گرچہ اس کے بعد بھی وہ چوری چھپے دوسری لڑکیوں کے ساتھ کھیتوں یا درختوں سے ڈھکے ڈھلانوں میں یا پھر ریلوے کے کھنڈروں کی طرف نکل جایا کرتی تھی، جس کی خبر اس کی پوس پالک ماں کو تھی، مگر اس نے کبھی اعتراض نہیں جتایا تھا۔ آخر وہ ایک ذہین لڑکی تھی جسے، اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے برعکس، اسکول جانا پسند تھا اور وہ ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوا کرتی تھی۔ صرف ایک بار اس کی ماں نے اسے ان تاریک کھنڈروں کی طرف جانے سے منع کیا تھا۔ انھوں نے اسے بتایا تھا کہ ان میں پشاچ گھوما کرتے ہیں جو بچوں کو پکڑ کر کھا جاتے ہیں۔ شاید ماں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ بڑی ہو چکی تھی اور اس کا ان کھنڈروں کے قریب جانا ٹھیک نہ تھا کیونکہ وہاں پر بچوں کے ساتھ کئی رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات پیش آ چکے تھے، جن میں کچھ تو واقعی پیش آئے تھے اور کچھ فرضی تھے جنھیں بچوں کو ڈرانے کے لیے گڑھ لیا گیا تھا۔

''انتظار کرو،'' صالحہ نے تھیلی دوسری بغل میں منتقل کرتے ہوئے تیرہ و تاریک کھنڈروں کی طرف دیکھا جہاں ایک آدھ بغیر کواڑ والی کھڑکی پر یا دیواروں کے اوپر بھوتوں کے سر ہلتے نظر آ رہے تھے۔ ''ایک دن میں پشاچ بن کر لوٹوں گی اور بچے کھایا کروں گی، جیسا انھوں نے میرے بچوں کو کھایا ہے۔''

26

ریلوے کی شکستہ عمارتیں پیچھے چھوٹ گئی تھیں۔ وہ اس کی چوحدی کے سامنے کھڑی تھی جس کے دوسری طرف اس کے منھ بولے باپ کی زمینیں شروع ہوتی تھیں۔ چوحدی کی اچھی خاصی اینٹیں مقامی لوگ نکال چکے تھے بلکہ کسی کسی جگہ تو بنیاد کی اینٹیں تک نکال لی گئی تھیں۔ ایسے ہی ایک گڈھے کو پھلانگ کر وہ ڈھال اتر رہی تھی جب اس نے فاصلے پر بنے ہوئے پختہ گھروں کے سلسلے کی طرف دیکھا جو اس کی شادی کے بعد وجود میں آئے تھے۔ وہ بہت دیر سے دھوپ میں چل رہی تھی اور گرچہ مانسون کی بارشوں کے سبب ٹھنڈ وقت سے پہلے آ گئی تھی، دھوپ کی تمازت سے اس کی گردن پر پسینہ جم رہا تھا۔ اس نے بندنا اتار کر اسے تہہ کیا اور تھیلی کے اندر ڈال دیا۔ پاس کے کسی کھیت سے واٹر پمپ کی آواز رک رک کر آ رہی تھی۔ جلد اسے اس کا نلی پائپ نظر آ گیا جس کے نلکے سے ابلتے پانی سے گوریتوں کا ایک جھنڈ چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ ڈھال اتر کر وہ سبزی کے کھیتوں کے درمیان کی پتلی منڈیروں کے اوپر چلنے لگی جن

کے بارے میں اسے پتا تھا کہ اس کے رضائی والدین کے تھے، بشرطیکہ وہ اب تک بک نہ گئے ہوں۔ ان میں لگے ہوئے بینگن اور ٹماٹر کے گہرے رنگوں کی طرف دیکھتے ہوئے اسے اپنا بچپن یاد آ گیا جب وہ اپنی ماں کے ساتھ کھیتوں میں سبزیاں توڑنے آیا کرتی تھی۔ کھیتوں کے اخیر میں ان کا اپنا بڑا سا تالاب تھا جس کے کنارے برگد کا ایک لحیم شحیم پیڑ اپنی جڑوں اور مچھیروں کے جال اٹھائے کھڑا تھا جو شاید سوکھنے کے لیے وہاں لٹکائے گئے تھے مگر اب فراموش کر دیے گئے تھے۔ یہاں سے یک منزلہ نئے مکانوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ اس نے برسوں سے ان گھروں کو نہیں دیکھا تھا جن میں ایک عجیب طرح کی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ زیادہ تر مکانات ٹوٹ پھوٹ گئے تھے، جو اتنے نئے مکانوں کے لیے ایک حیرت انگیز واقعہ تھا۔ کہیں پر کسی کے رہنے کا نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ کئی مکانوں کی کھڑکیوں اور روشندانوں سے کالک کی لکیریں نکل کر دیواروں پر مکڑی کے جالوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر گھروں کے چوکھٹ غائب تھے۔ ان کے بیچ سے گزرتے ہوئے ریلوے کھنڈروں کے مقابلے اسے زیادہ ٹھنڈ کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے اس واقعے پر حیرت ہو رہی تھی۔ شادی کے بعد اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے انھیں بنتے دیکھا تھا مگر اتنے تھوڑے سے عرصے میں ایسا کیا ہو گیا تھا کہ تمام گھر اتنی شکستہ حالی کو پہنچ گئے تھے۔ جہاں تک نظر کام کر رہی تھی، اینٹیں اور پلستر دیواروں کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔ چونکہ شادی کے بعد وہ جب بھی آئی تھی رکشا سے سیدھے اپنے گھر کی ڈیوڑھی پر اترتی، اس نے ان گھروں کی بدحالی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر آج اس نے جان بوجھ کر اس کھنڈروں والے راستے کا انتخاب کیوں کیا تھا؟ شاید وہ آخری بار ان تمام چیزوں کو واپس پانا چاہتی تھی جنھیں وہ بچپن میں یہاں چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ ایک گھر کی کھڑکی کے سامنے رک گئی جس کا سارا حصہ منہدم پڑا تھا سوائے ایک واحد کمرے کے جس میں یہ کھڑکی لگی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے اندر ایک آدمی لکڑی کی ایک کرسی پر بیٹھا اسی کی طرف تاک رہا تھا۔ اس کے دونوں کندھے اور سارا چہرہ پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ اس کی صرف ایک آنکھ بچی تھی اور منھ کی جگہ پٹیوں کے بیچ ایک خون اور پیپ سے ڈھکا ہوا سوراخ تھا۔ وہ شاید اسے دیکھ کر کھڑکی پر چلا آیا تھا۔ صالحہ کی توجہ اپنی طرف پا کر اس نے اپنے منھ کی طرف اشارہ کیا جو وہاں نہیں تھا۔

''یہاں کیا ہوا تھا؟'' صالحہ نے آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔ اسے لگا چونکہ اس کے کان پٹیوں میں دفن تھے، شاید اسے اس کی آواز سنائی نہ دیتی ہو۔ کچھ نہ سنتے ہوئے بھی اس شخص نے مسکرانے کی

کوشش کی کیونکہ منھ کی پٹیوں میں شکنیں جاگ گئی تھی۔ وہ شاید اپنی واحد آنکھ سے اس بات کا اظہار نہیں کر پا رہا تھا جس کا اظہار وہ کرنا چاہتا تھا۔ صالحہ نے اس شخص کی بے بسی کو محسوس کیا اور اپنی آواز اونچی کرتے ہوئے کہا:

''کیا یہاں پر آسمان سے بم گرائے گئے تھے؟'' اس نے دونوں ہاتھوں کو ہوائی جہاز کی شکل میں پھیلایا اور داہنی مٹھی کو گولے کی شکل میں نیچے لا کر بم کی آواز نکالی۔ پٹیوں پر شکنیں پھر سے جاگ اٹھیں۔ وہ آدمی واقعی مسکرا رہا تھا۔ جانے کیوں اس مسکراہٹ سے اسے دلی سکون کا احساس ہوا۔ اس نے ابھی لوٹنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس شخص کے منھ سے ایک عجیب آواز نکلی اور اس کے پیر تھم گئے۔ وہ شاید کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صالحہ خاموش کھڑی اس کی آواز کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر سوراخ سے آواز کا آنا بند ہو گیا۔ وہ شخص بے بسی کے ساتھ اپنی واحد آنکھ سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ اس نے مایوسی سے سر ہلایا تھا۔

''مجھے کچھ بھی نہ بتایئے، یہ ہم دونوں کے لیے اچھا رہے گا۔'' اس نے اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر گھر کے دوسرے رہائشی کمروں کی طرف دیکھا جن کی دیواریں ڈھے چکی تھیں اور صحن پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ''ویسے بھی میرے اپنے دکھ کیا کم ہیں کہ دوسرے کے بٹورتی پھروں۔''

27

ان گھروں سے احتراز کرتے ہوئے جن میں اب بھی کسی کسی میں لوگ رہ رہے تھے (اس کے اندر اب مزید کسی دوسرے آدمی سے ملنے کی ہمت نہ تھی بلکہ ان گھروں سے ایک طرح سے وہ خوفزدہ نظر آ رہی تھی) وہ ایک کچے راستے سے گزری جہاں ہر طرف بانس کے جھنڈ تھے۔ جلد ہی اسے اپنے قصبے کے کھپریل کے چھپر نظر آنے لگے جو اَب بھی کچی دیواروں پر رکھے ہوئے تھے، اور اس نے اطمینان کی ٹھنڈی سانس لی۔ گھروں کے درمیان کھلے آنگنوں سے گزرتے ہوئے جہاں عورتیں کپڑے پسار رہی تھیں یا کھانا پکا رہی تھیں یا گایوں کو چارا ڈال رہی تھیں یا بچے بچیاں کھیل رہے تھے، اس نے جگہ جگہ ہینڈ پمپ کھڑے پائے جو وہاں پر اس سے پہلے اس نے نہیں دیکھے تھے۔ ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے سے ہوتے ہوئے وہ اپنے محرابوں اور گنبدوں والے مکان کی ڈیوڑھی پر پہنچ گئی۔ تالاب کا

پانی جھاڑیوں اور پودوں سے ڈھک چکا تھا۔ خود تالاب کے اندر اچھی خاصی تعداد میں نوکیلی ٹہنیوں والے بانس ڈلے ہوئے سڑ رہے تھے جو اُن دنوں کی یادگار تھے جب اس تالاب میں بکثرت پانی ہوا کرتا تھا اور مچھلیوں کی چوری سے بچنے کے لیے انھیں وہاں ڈالنا پڑتا تھا۔ اسی تالاب میں اس نے گھر کی تمام لڑکیوں کے ساتھ تیرنا سیکھا تھا۔ وہ جب تک گاؤں میں تھی، اس نے آس پاس کی تمام عورتوں کو مسجد کے پیچھے کی صاف ستھری جگہ پر کپڑے اور ہانڈی برتن دھوتے دیکھا تھا۔ وہاں اب بھی کئی پتھر رکھے ہوئے تھے مگر اب وہ جگہ ویران پڑی ہوئی تھی۔ ظاہر تھا، قصبے کے راستوں پر ہینڈ پمپ جو لگ چکے تھے۔ ڈیوڑھی کے باہر برگد کے پرانے درخت کے نیچے ان لوگوں کی سفید ایمبیسڈر کار کھڑی تھی۔ اس سے لٹکتی جڑوں کے نیچے ازبستوس کے ایک بڑے سے شیڈ میں دادا جان کے زمانے کی کالے رنگ کی لمبی گاڑی دھول سے اٹی کھڑی تھی۔ اس کے سڑے گلے پہیے گھاس کے اندر چلے گئے تھے۔ کار کے بڈ اور باڈی پر چڑیوں کی بیٹوں کے تازہ نشان تھے کیونکہ برگد کا یہ چھتنار پیڑ بگلوں کا ایک بڑا مسکن تھا جن کی وجہ سے خود برگد کا پیڑ سفید ہو رہا تھا۔ قریب سے گزرنے پر صالحہ نے دیکھا، گاڑی کے ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے شیشے بہت ہی حیرت انگیز طور پر اب بھی اپنی جگہ موجود تھے گرچہ دھول میں اٹے ہونے کے سبب اندر کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید گاؤں میں اب بھی اس کے منھ بولے باپ کا دبدبہ قائم تھا۔ شادی کے بعد بھی اس نے ایک دو بار اس گاڑی میں اپنے جڑواں بچے کے ساتھ سفر کیا تھا جب اس کے چھوٹے بچے کی پیدائش نہیں ہوئی تھی۔ اُن دنوں بچے بوڑھے سب لوگ اسے 'آسٹن صاحب' کہا کرتے۔ بعد میں آسٹن صاحب اسی جگہ کھڑی رہنے لگی، اور پھر ایک دن چھپر کے نیچے فراموش کر دی گئی۔ اب وہ صرف پرانی شان و شوکت کی ایک یادگار بن کر رہ گئی تھی۔ ڈیوڑھی کے سامنے رک کر، جہاں بجلی آنے سے پہلے طاقچوں میں لالٹینیں جلا کرتیں، اس نے سوچا اب کہ وہ اتنی دور آ گئی ہے اور اسے خود بھی نہیں معلوم کہ وہ وہاں پر کس لیے آئی ہے، کہ اسے ان لوگوں سے کیا چاہیے جبکہ اس کے پاس مقروض ہونے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہے، تو کیا اسے یہاں سے واپس چلا جانا چاہیے؟ وہ تو اپنے جان پہچان کے لوگوں کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھی، پھر یہاں کیسے آ گئی؟ اور کوئی آ گیا تو وہ اس کا سامنا کیسے کرے گی؟ کہاں چھپے گی؟ اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا ان لوگوں تک اس کے سانحے کی خبر پہنچ چکی ہے؟ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی جب اس کی نظر ڈیوڑھی پر گئی جس کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا ہوا جیسے اس کی راہ دیکھ

رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے مویشی گزرے ہوں کیونکہ چوکھٹ پر گوبر کا نشان نظر آ رہا تھا۔ ڈیوڑھی کے اندر کا پختہ آنگن تینوں اطراف سے کمروں سے گھرا ہوا تھا مگر قدِ آدم سلاخوں کے پیچھے زیادہ تر کھڑکیوں کے پٹ بند تھے۔ جو کھلی ہوئی تھیں ان کے اندر روشنی سے گھلا ہوا اندھیرا تھا۔ برآمدے کے ایک سرے پر ماں نواڑ کے پلنگ پر ایک بھاری بھرکم تکیہ کے سہارے لیٹی ہوئی تھی۔ جب سے وہ بیمار ہوئی تھی، اسی جگہ اس کا ٹھکانہ کر دیا گیا تھا۔ پلنگ کے سامنے اس کا منھ بولا باپ ایک بید کی آرام کرسی پر بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سگریٹ سلگ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کاؤ ننگ مشین تھی جسے صالحہ کو دیکھتے ہی اس نے تپائی پر رکھ دیا۔ تو انھوں نے حقہ پینا چھوڑ دیا ہے! ایک نوکر اندر سے باہر آیا۔ وہ ایک مونڈھا اٹھائے ہوئے تھا۔ صالحہ اسے پہچانتی تھی۔ وہ کسی کی ناجائز اولاد تھا جسے اس کی منھ بولی دادی، جسے اس نے نہیں دیکھا تھا، ریل لائن سے اٹھا کر لائی تھی۔ کتنا بڑا ہو چکا تھا وہ، چہرہ مہرہ بھی کتنا بدل گیا تھا اس کا۔ اسے پتا تھا، اس کی شادی کر دی گئی تھی اور اب اس کی بیوی اسی گھر میں نوکرانی کا کام کرتی تھی۔ صالحہ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ جواباً وہ بھی مسکرایا تھا، مگر شاید اسے اس کے سانحوں کا پتا چل چکا تھا یا پھر ہو سکتا ہے اس کے سلسلے میں گھر کے لوگوں کے رویے کا اسے احساس ہو اور وہ اپنے لیے کوئی پریشانی کھڑی کرنا نہ چاہتا ہو۔ وہ دونوں بچپن میں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے، بلکہ اس کی منھ بولی ماں کے کہنے پر اس نے اسے سلیٹ پر اردو لکھنا بھی سکھایا تھا۔ اسے گھر کی ویرانی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بچے بڑے ہو گئے ہوں گے، کچھ تو ان کے اپنے بچوں سے بھی بڑے ہو گئے ہوں گے۔ اس کے منھ بولے بھائی بہن کہاں گئے جنھیں اس نے پچھلی بار دیکھا تھا؟ کیا اسے آتے دیکھ انھیں گھر کے اندر کر لیا گیا تھا؟ اس نے یہاں آکر غلطی تو نہیں کی تھی؟ مگر اب کہ وہ سچ مچ آ چکی تھی، اس کے پاس چارہ ہی کیا تھا سوائے اس کے کہ ان لوگوں کا سامنا کرے۔

ان دو سالوں میں اس کے باپ کے سارے بال پک چکے تھے۔ انگلیوں کی زیادہ تر انگوٹھیاں غائب تھیں جن میں آخری وقت تک صالحہ نے اسے لدے پھندے دیکھا تھا۔ گھنی جھاڑی نما بھنوؤں کے نیچے عینک کے اندر اس کی آنکھیں کافی بے چین نظر آ رہی تھیں۔ یہ آنکھیں کتنے صاف ڈھنگ سے بتا رہی تھیں کہ اب ان دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ سلام کر کے صالحہ مونڈھے پر بیٹھ گئی اور ماں کے سینے پر جھک کر اس کا سر سہلانے لگی۔ ماں نے اس کا دوسرا ہاتھ اپنے لاغر ہاتھوں میں لے لیا

تھا اور اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان آنکھوں میں ایک سچی ماں کا پیار جھلک رہا تھا جسے صالحہ نے ہمیشہ اس جگہ دیکھا تھا اس کے باوجود کہ اس کے اپنے ڈھیروں بچے ہوتے چلے گئے تھے۔

"کیسی ہو ماں؟"

"مر رہی ہوں،" ماں بولی۔ اس کی آواز میں کسی جذبے کا شائبہ نہ تھا۔ کیا ایک عورت کو جسے زندگی میں سب کچھ حاصل ہو اس کی طرح ویرانی سے گزرنا پڑتا ہے؟ شاید انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام چیزیں اپنے معنی کھو چکی ہوتی ہیں۔ انھیں کسی سانحے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

"ڈاکٹر نے وہی کہا جو ہر ڈاکٹر کو کہنا چاہیے۔" ماں اس سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ شاید اسے پتا تھا وہ کن حالات میں وہاں پر آئی تھی اور اس کے برے وقت میں ان لوگوں نے اس کی خبر تک نہیں لی تھی۔ "ایک دن آتا ہے جب ڈاکٹروں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بس دوا دے کر چلے جاتے ہیں۔ اس کے لیے تم انھیں قصوروار ٹھہرا نہیں سکتیں۔"

"میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ تمھیں اس طرح مایوسی کی باتیں نہیں کرنی چاہییں، اس سے دوا کمزور پڑ جاتی ہے،" اس کے باپ نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک ٹک سگریٹ کی راکھ کی طرف دیکھا جو لمبی ہو کر ٹیڑھی ہو گئی تھی اور کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔ "تمھاری ماں ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے بس کینسر ہی تو ہے۔ اور یہ کوئی اتنی بڑی بیماری نہیں رہی، اس کا علاج ڈھونڈ لیا گیا ہے، صالحہ سے پوچھ لو۔ کیا اس کے بعد بھی لوگ برسوں تک زندہ نہیں رہتے؟ اور اب تو درد کم کرنے کی دوائیاں بھی آ گئی ہیں۔" اس نے ہاتھ فرش تک لے جا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور اس کی طرف دیکھا۔ "ہم تمھارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ مگر ہمیں امید نہیں تھی کہ تم اتنی جلد آؤ گی۔ کیا تم ہمیشہ کے لیے رہنے آئی ہو؟"

"کیا بچی کو کچھ کھانے پینے کے لیے بھی نہیں پوچھیے گا؟ کتنی دور سے آئی ہے وہ۔ اسے پیاس لگی ہوگی۔"

"کیا مجھے نہیں آنا چاہیے تھا؟" صالحہ نے مسکرا کر اپنے باپ کی آنکھوں سے سوال کیا۔ بوڑھا جواب دیے بغیر سگریٹ کے کش کھینچتا رہا۔ صالحہ نے محسوس کیا، آنگن میں کھلنے والی کھڑکیوں میں ہمیشہ کی طرح نہ نظر آنے والی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے لیے کانچ کے گلاس میں پانی اور ٹرے پر

بازار کا ناشتہ لایا گیا۔ پانی کا گلاس خالی کر کے اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''آپ لوگوں کو کیا لگتا ہے، دنیا میں میں بالکل اکیلی ہوں؟ ایسا بھی نہیں ہے۔ میری دنیا اب بھی وہی ہے۔ اس میں کچھ بھی بدلا نہیں ہے۔''

''تم کچھ کھالو بیٹا،'' ماں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا اور بستر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ صالحہ نے اسے پیروں پر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ ماں کو چپل پہناتے پہناتے وہ اپنے آپ کو روک نہ پائی اور اس کے کمزور پیروں سے لپٹ کر رو پڑی۔ اس نے اپنا چہرہ اس کی ساڑھی میں چھپا لیا تھا۔ ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ وہ کھڑی ہوئی تو اس کے آنسو سوکھ چکے تھے مگر آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ماں کو تھامے ہوئے وہ گھر کے اندر گئی جہاں اس کے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ بے چینی سے اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر یہ وہ بچے تھے جو اس کے گھر سے وداع ہونے کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ اس کے دونوں بھائی، جو اس کے رہتے پیدا ہوئے تھے، بورڈنگ اسکولوں میں پڑھ رہے تھے اور چاروں بہنیں اپنے ننھیال میں پل رہی تھیں جہاں انھیں کالج میں داخل کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ایک آدھ کی شادی ہو گئی ہو، گرچہ اسے یاد نہیں ان لوگوں نے کبھی کسی شادی کا نیوتا بھیجا ہو۔

دن کا کھانا کھا کر وہ باہر آئی تو اکیلی تھی۔ اس کا باپ آرام کرسی پر ایک سی حالت میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ صالحہ کو مونڈھے پر بیٹھتے دیکھ کر اس نے کہا، ''ہمارے حالات اب اچھے نہیں رہے۔ زیادہ تر سبزی کے کھیت بک چکے ہیں۔ تالاب پر برگداروں کا قبضہ ہے۔ دن بدن ان کھیتوں میں پانی لانا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ہم لوگوں نے تمھارے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تھا، لیکن اسے سمجھانا آسان نہیں۔ ہو سکتا ہے ہم سے تمھیں ٹھیس پہنچی ہو۔''

''نہیں ابو، مجھے آپ لوگوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

''تمھیں مدد چاہیے؟'' اس کے باپ نے آخری کش لے کر سگریٹ کا ٹکڑا آنگن کے صحن پر پھینک دیا جو زیرِ زمین پائپ کے منھ سے ابلتے گندے پانی کے ساتھ بہتا ہوا دیوار کی طرف چلا گیا۔ اس جگہ ایک چینی مرغی، جس کی گردن کے بال اڑ چکے تھے، اپنے چوزوں کے ساتھ دانہ چگ رہی تھی۔

''کس لیے؟'' صالحہ مسکرائی۔ ''اور کس کے لیے؟ جب میں اتنے لوگوں کا پیٹ بھر سکتی تھی تو کیا اکیلی نہیں جی سکتی؟''

''تم اب بھی جوان ہو، صالحہ۔ تمھیں اچھا آدمی مل سکتا ہے۔ اس بار ہم صحیح آدمی ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ پچھلی بار ہم نے جلد بازی کی تھی۔''

''مجھے اچھا آدمی مل جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں نے اوپر والے تک اپنی بات پہنچائی ہے۔ آپ ماں کا خیال رکھیے۔''

''تمھاری ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تم کچھ دنوں کے لیے ٹھہر کیوں نہیں جاتیں؟ تمھارے سامان کیا ہوئے؟''

''میں رہنے کے لیے نہیں آئی ہوں، ابو۔'' صالحہ مونڈھے سے پیٹھ ٹکا کر اپنے باپ کی طرف تاکنے لگی۔ ''اب میرے پاس دکھی ہونے کے لیے بچا ہی کیا ہے۔ دوسری طرف دکھی ہونے کے لیے کتنا کچھ ہے آپ لوگوں کے پاس، جو دِکھ بھی رہا ہے۔ ابو، کیا اتنے برے دن آ چکے؟''

''تم زمین کا کاغذ لینے آئی ہو؟'' ابو نے اس کے آخری جملے کو درگزر کرتے ہوئے کہا۔

صالحہ نے اپنے باپ کی انگلیوں کی طرف دیکھا جنھوں نے کئی صفحوں پر مشتمل ایک دستاویز تھام رکھی تھی۔ وہ اسے صالحہ کی طرف بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''کیا زمین نام کی کوئی چیز بھی ہے؟'' صالحہ ہنسی۔ اس نے اپنی دونوں مٹھیاں گود میں بھینچ رکھی تھیں۔ ''وہ دو چالہ تو اللہ کی زمین پر بنا ہوا ہے جو کب کا جل کر راکھ بھی ہو چکا۔ آپ لوگ خواہ مخواہ کاغذ کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔''

اس کا باپ اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''پھر بھی اسے اپنے پاس رکھ لو۔ یہ تمھارے گھر کی دلیل ہے۔ میں نے اپنے وکیل سے بات کر لی ہے۔ اگلی بار شہر آیا تو یہ گھر تمھارے نام کر دوں گا۔ مجھے پچھلی بار ہی یہ کام کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن اب میں پہلے کی طرح طاقتور نہیں رہا۔ روپے پیسے کے معاملے میں جلد فیصلے نہیں لے پاتا۔ کبھی کبھی فیصلہ لینے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ میں بوڑھا ہو رہا ہوں، صالحہ۔ مجھے معاف کر دینا۔''

صالحہ نے دیکھا، اس کا دستاویز تھاما ہوا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے اسے تھام لیا۔

وہ دستاویز کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی گرچہ یہ ایسی چیز نہیں تھی جو اس کے پلے پڑتی۔ اس کا منھ بولا باپ گردن گھما کر ایک نیا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ آخر کار صالحہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور

دستاویز تکیے کے اوپر واپس رکھ دی۔ اس کے باپ نے سگریٹ پینا بند نہیں کیا تھا۔ صالحہ اٹھی اور باپ کے سامنے فرش پر گھٹنے ٹیک کر اپنا چہرہ اس کی گود میں چھپا لیا۔ اس کا باپ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

"وہ گھر تمھارا ہے۔ میں جلد ہی وکیل کے ساتھ آؤں گا۔"

"وہ گھر جل کر راکھ ہو چکا،" صالحہ نے اپنی بات دہرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ماں برآمدے پر کھلنے والے دروازے کا پردہ اٹھائے کھڑی تھی۔ صالحہ نے اس سے لپٹ کر اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ ترچھی آنکھوں سے اپنے باپ کی طرف تاک رہی تھی۔ "ابو، قصبے کے باہر وہ نئے گھر کن لوگوں نے توڑے؟"

"فسادیوں نے دھاوا بول دیا تھا۔ وہ بلڈوزر بھی لے کر آئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگوں نے آدی باسیوں کی زمین پر غیر قانونی طور پر قبضہ جما رکھا ہے۔ ہمارا کھلیان بھی جلا دیا گیا۔ اب اس ملک میں ہمیں ان چیزوں کی عادت ڈالنی پڑے گی۔" اس کا باپ کسی قسم کے جذبے کا اظہار کیے بغیر ڈیوڑھی کی طرف تاک رہا تھا۔ "وہاں سے بہت کم لوگ بھاگ پائے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کو پولیس اٹھا کر لے گئی، ان میں اب بھی کئی جیل میں ہیں۔ انھوں نے نہر پر لے جا کر کئی درجن جوانوں کو گولی سے بھی اڑا دیا تھا۔ وہ مقدمے ابھی عدالت میں چل رہے ہیں۔ ان لوگوں کا ارادہ ہمارے قصبے پر بھی حملہ کرنے کا تھا، مگر تالابوں کے سبب وہ ایسا کر نہ پائے۔ اور پھر ٹی وی والے بڑی تعداد میں کیمرا لے کر آ گئے تھے۔ قصبے کے لوگ اپنی حفاظت کے لیے اور بھی تالاب کھدوانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

"اور کھلیان کی بلیاں؟"

"بھاگ نکلی ہوں گی۔" اس کس باپ تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "انھیں کون مار سکتا ہے؟"

"صحیح کہا آپ نے،" صالحہ اپنے باپ کے پاس آتے ہوئے بولی۔ "ہم انسانوں کے برعکس ان کی نو زندگیاں ہوتی ہیں۔ لیکن یقین کیجیے، میں بھی ایک بلی ہوں۔"

اس کا باپ ایک نئی حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے کچھ پیسہ چاہیے، ابو۔"

"کتنا؟"

"مجھے نہیں پتا۔"

اس کا باپ اٹھ کر گھر کے اندر گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا لفافہ تھا جسے دیکھ کر لگ رہا تھا، شاید اسے پہلے سے تیار کر کے رکھا گیا تھا۔ لفافہ تھام کر صالحہ نے اس کے وزن کا اندازہ لگایا اور اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "میں شاید ماں کے مرنے پر نہ آ سکوں۔"

اس نے کوشش کی تھی کہ ماں تک اس کی آواز نہ پہنچے۔ اس کے بعد وہ گھر کے اندر گئی اور ماں اور بھائی بہنوں کے ساتھ دیر تک دنیا جہان کی باتیں کرتی رہی۔ اسے پتا چلا، ابھی تک اس کی کوئی بہن بیاہی نہیں گئی تھی، بلکہ ایک پر پاگل پن کے دورے بھی پڑنے شروع ہو گئے تھے۔

"تم رکو گی نہیں؟ ایک دو دن ٹھہر جاؤ،" ماں بولی۔

"نہیں ماں، وہاں کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔"

سورج مغربی آسمان کو چھو رہا تھا جب وہ جانے کے لیے اٹھی۔ وہ لوگ تالاب کے کنارے تک اسے چھوڑنے آئے۔ ڈرائیور داڑھی والے ایک مولوی تھے جو ایمبیسڈر کار کے سامنے صالحہ کا انتظار کر رہے تھے، مگر صالحہ نے اس پر سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ تھیلی بغل سے لٹکائے تالاب کے کنارے چلی جا رہی تھی جب اس کے باپ نے، جو لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر نکل آیا تھا، کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا، "وہ ہمیشہ سے ایک طاقتور ارادے والی لڑکی رہی ہے۔ اتنے حادثات کے بعد بھی تم نے دیکھا، کیا وہ کہیں پر بھی تھوڑی سی بھی کمزور پڑی ہے؟ اس سے ذہین لڑکی میں نے دوسری نہیں دیکھی۔"

تالاب اور قصبے کے گاؤں نما گھروں سے گزر کر وہ منہدم شدہ مکانوں کے درمیان پہنچ گئی تھی۔ دھوپ کی حرارت کم پڑ گئی تھی۔ بادلوں کے درمیان لالی پھوٹ رہی تھی جب اس نے ٹوٹے ہوئے گھر کی کھڑکی پر دستک دی۔ اسے بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ میدانوں کی طرف سے سناٹا تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا۔ وقت سے پہلے ہی جھینگر بولنے لگے تھے۔ اس نے دوبارہ دستک دی۔ کچھ دیر بعد کھڑکی کھل گئی۔ اس میں پٹیوں سے جکڑا ہوا آدمی کھڑا تھا۔ اس کی پٹیوں پر آسمان کی لالی گر رہی تھی۔ اس کی واحد آنکھ کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس سے خون کا ایک قطرہ ٹپکنے کے لیے بے چین ہو۔

"اپنے آنسو بچا کر رکھیے،" صالحہ نے لفافہ کھڑکی کے چوکھٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ لوگ پھر آئیں گے اور ہمیشہ آتے رہیں گے۔"

پٹیوں میں جکڑے ہوئے انسان نے لفافے پر اپنی غلیظ انگلیاں گھستے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا جو سبزی کے کھیتوں کے بیچ تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک ایسے آسمان کے نیچے چلی جا رہی تھی جس کی سرخی میں چیل کوے اور پتنگ گھل مل گئے تھے۔

28

اندھیرا اتر چکا تھا جب وہ گھر پہنچی۔ اس کی کھڑکی میں روشنی ہوتے دیکھ کر محلے کے دو افراد اس کی طرف لپکے جن میں سے ایک تو وہی چیچک رو آدمی تھا جو ہمیشہ اس کے گھر کے آس پاس منڈلایا کرتا۔

"اب کیا ہے؟" صالحہ نے کھڑکی کے پٹ کھولتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے کپڑے بدل چکی تھی اور بالوں کی لٹیں کنگھی سے چھڑاتے ہوئے کافی تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ "اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔"

"تم جس گھر میں کام کرتی ہو وہاں کا دربان آیا تھا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے بھی دکھائی دیا تھا۔ تمھارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ کل صبح آنے کا کہہ کر گیا ہے۔ بہت بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ اتنے بوڑھے دربان سے لوگ کیسے کام چلاتے ہوں گے؟"

"کیا اس کی داڑھی تھی؟" صالحہ نے پوچھا۔

"دودھ کی طرح سفید۔"

"پھر وہ کوئی دوسرا آدمی ہوگا۔"

"وہ کل صبح پھر آئے گا۔ تم خود دیکھ لینا۔"

"صبح کا صبح دیکھیں گے،" صالحہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔"

وہ اپنے سفر سے بہت تھکی ہوئی تھی۔ اسے بہت جلد گہری نیند نے آ دبوچا۔ اس رات اس نے خواب میں دو بلیوں کو دیکھا جو ایک چھپر پر بیٹھی تھیں اور چوراہے پر بنے سرکاری کنویں کی طرف تاک رہی تھیں جہاں پر وہ اکیلی کھڑی تھی۔ کنویں کے سامنے ایک دمکل کی گاڑی کے پائپ سے خون ابلتا ہوا نالوں کے اندر جا رہا تھا۔ اسے ایک جیپ بھی نظر آئی جس کے سامنے چادر سے ڈھکی ایک چارپائی رکھی تھی جس سے ایک انسانی ہاتھ لٹک رہا تھا۔ اس وقت سورج آسمان سے جانے کہاں چلا گیا تھا۔ فاصلے

پر بنے شہر کے پختہ مکانات کہرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ محلے کی جھونپڑیوں کے بیچ سے نکلے ہوئے بجلی کے کھمبے نیلی چنگاریاں چھوڑ رہے تھے۔ چوراہے پر دیر تک چپ چاپ کھڑی وہ دمکل کے پائپ سے خون ابلتے دیکھتی رہی۔

دونوں بلیاں چھپر سے اتر کر کنویں کے صحن پر چلی آئی تھیں۔ یہ اسی کی بلیاں تھیں۔

"واپس گھر جاؤ،" اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر بلیوں کو تاکید کی، مگر وہ صحن پر کھڑی ہو کر دم میں ہوا میں اینٹھتی رہیں۔ بلیوں کو ان کے حال میں چھوڑ کر ساڑھی کے گھیرے کو اوپر اٹھائے ہوئے وہ گلی میں داخل ہوئی جو خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اپنے پیر خون کے اندر ڈالتے ہوئے وہ دروازے تک آئی جس کا تھڑا نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھڑے پر چڑھ کر اس نے اس پر لٹکتا ہوا قفل کھولا اور دروازے کو اندر کی طرف ڈھکیل کر کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ اندر سے بند تھا جو ایک حیرت انگیز واقعہ تھا۔ اس کے سارے لوگ تو مر چکے تھے، اندر کون ہو سکتا تھا؟ بند دروازے کی طرف سوالیہ نظروں سے تاکتے ہوئے اس نے دروازے پر پھر سے دستک دی اور لاشعوری طور پر باری باری سے اپنے شوہر اور بچوں کو آواز لگائی۔ اور جب اس احساس کے ساتھ کہ وہ لوگ اب اس دنیا میں نہیں تھے، وہ چپ ہو گئی تھی، دروازہ اچانک کھل گیا۔ اس نے دیکھا، اس کا شوہر تینوں بچوں اور دونوں بلیوں کے ساتھ دالان گھر کی سیڑھی کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ لوگ سیڑھی چڑھنے لگے اور ایک ایک کر کے غائب ہوتے چلے گئے۔ بلیاں سب سے آگے تھیں۔ فرش سے لے کر سیڑھی تک ان کے خون میں ڈوبے ہوئے پنجوں اور پیروں کے نشانات بنتے جا رہے تھے۔ اس کا شوہر، جو سب سے آخر میں تھا، رک کر مسکرایا اور سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر چلا گیا۔ وہ اس واقعے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک جیسے اس کی محویت ٹوٹ گئی۔ وہ جلدی جلدی سیڑھی چڑھ کر چھت پر آئی جو ویران پڑی ہوئی تھی۔ منڈیر پر دیر تک ہاتھ رکھ کر وہ محلے کے چھپروں کی طرف تاکتی رہی۔ گلیوں میں کھڑے بجلی کے کھمبے نیلی چنگاریاں چھوڑ رہے تھے۔ خود اس کی اپنی گلی سیاہ خون میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

دوسری صبح صدر دروازہ کھول کر اس نے دیکھا، گلی میں کہیں پر خون کا نام و نشان نہ تھا۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور دیر تک آنگن میں بیٹھی دیوار کے دوسری طرف سے عورتوں کی باتیں سنتی رہی۔ ان کی باتوں کو سنتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی، ہم عورتوں کی دنیا کتنی چھوٹی ہوتی ہے، کتنی کم زمین پر ہم زندہ

رہتے ہیں اور کتنے کم لفظوں کے سہارے، ہم اپنی زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

سورج آسمان پر کافی اوپر آ چکا تھا جب اسی مخصوص آدمی نے جو ہمیشہ اس کے گھر کے باہر منڈلایا کرتا، اس کی کھڑکی پر دستک دے کر بتایا کہ دربان سرکاری کنوئیں پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ چوراہے پر پہنچی۔ اس نے دیکھا، دربان کنوئیں کے صحن پر بیٹھا دور شہر کی طرف تاک رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تمھاری بستی شہر کے باہر تو ہے مگر ایک اچھے مقام پر بسی ہوئی ہے،" صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اس کے سانحات سے توجہ ہٹانے کے لیے یہ سب کہہ رہا تھا۔ "رہنے کے لیے اونچی جگہیں اللہ کی نعمت ہوتی ہیں مگر یہ نیچی جگہیں ہوتی ہیں جہاں سے ہمیں اناج ملتا ہے۔ مجھے حیرت ہے اب تک لوگوں کی نظر اس بات پر کیوں نہیں پڑی۔ جدھر دیکھو، لوگ کھیتوں اور نالوں میں گھر بنانے لگے ہیں۔ یہ رہا تمھارا باقی پیسہ۔ گن لو، پورے ہوں گے۔ اگر کچھ زیادہ ہوئے تو مجھے کوئی حیرانی نہ ہوگی۔"

"وہ لوگ جلد آ دھمکیں گے۔" پیسہ تھامتے وقت اس نے دربان کی طرف دیکھا بھی نہ تھا۔ صحن پر بیٹھ کر اس نے اپنی کہنیاں گھٹنوں پر رکھ لیں۔ اسے بیٹھتے دیکھ کر دربان بھی تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیٹھ گیا۔ دربان کو پتا نہ تھا وہ کن لوگوں کا ذکر کر رہی تھی مگر اس نے کریدنا ضروری نہ سمجھا۔ صالحہ نے محلے کے دھول سے اٹے چھپروں کی طرف دیکھا جن کے خاتمے پر ٹیلے پر تاڑ اور کھجور کے درختوں میں ہمیشہ کی طرح گدھ بیٹھے ہوئے تھے مگر ان کی موجودگی کو اتنے فاصلے سے سمجھنا صرف اسی وقت ممکن تھا جب وہ پر پھڑپھڑاتے ہوئے ڈال یا پیڑ بدلتے ہوں، اور اس وقت تو وہ ساکت و جامد بیٹھے ہوئے تھے، یا شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اڑ کر وہاں سے جا چکے ہوں۔

"میں پچھلے آدھے گھنٹے سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے تمھارے دروازے پر کئی دستکیں دیں۔ پھر میں نے دیکھا، نالے میں ایک کتے کا بچہ مرا پڑا ہے۔" دربان نے اپنی بڑی آنکھ کے حلقے کو اور بھی وسیع کر لیا تھا اور کسی مسخرے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ "میں نے سوچا تمھیں پریشان کرنا ٹھیک نہ ہوگا، اور یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔"

"تم میرے گھر کے دروازے پر بیٹھ کر بھی انتظار کر سکتے تھے۔ یا دستک دے سکتے تھے۔"

"میں نے بتایا نا، وہاں کتے کا پلا مرا پڑا تھا۔ مجبوراً مجھے یہاں آنا پڑا۔ یہ جگہ بڑی پر فضا ہے۔

یہاں سے سارا شہر اور دریا دکھائی دیتا ہے بلکہ موسم اچھا ہو تو ہم بڑے پل اور دریا کو بھی دیکھ سکتے ہیں، جیسا کہ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔"

صالحہ کو یاد آیا، یہ اس کے شوہر کی بھی پسندیدہ جگہ ہوا کرتی تھی۔

"مجھے تمھیں بچوں کی یاد نہیں دلانی چاہیے۔" دربان اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "گرچہ اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے، مگر یہ تھوڑا سا عجیب ہے۔ میں نے اس سے برا واقعہ اپنی پندرہ برس کی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ ان دس سال کے بچوں سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟"

"تم پچاس کے ہو چکے ہو۔ تم نے دنیا میں اس سے بھی برے واقعات دیکھے ہوں گے۔" اسے پٹیوں سے ڈھکے ہوئے انسان کا چہرہ یاد آ گیا۔

"پچاس برس؟ میں تو اس دنیا کو صرف پندرہ برس سے دیکھ رہا ہوں۔" دربان نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ "اور ان پندرہ برسوں میں تم مجھ سے کیا امید رکھتی ہو کہ میں ساری دنیا کے واقعات کو اپنے اندر سمیٹ لوں؟"

صالحہ حیرت سے اس پچاس سالہ شخص کی طرف دیکھ رہی تھی جو نہ صرف خود کو پندرہ برس کا بتا رہا تھا بلکہ اپنے ماضی سے بھی منکر تھا۔

"اور پندرہ برس پہلے تم کہاں تھے؟"

"مجھے کیا پتا! پندرہ برس قبل میری آنکھ کھلی تو میں بڑے پل سے گزر کر اس شہر کے اندر آ رہا تھا۔ تب سے اس شہر کے اندر ہوں۔ اور اس میں حیران ہونے کے لیے کیا ہے؟ کیا آدمی کے اتیت کا ہونا ضروری ہے؟"

صالحہ نے سر جھکا لیا۔ وہ شاید اپنی بے تکی بات چیت سے اس کی توجہ اس کے سانحے سے ہٹانا چاہتا تھا، یا شاید وہ اس کا کسی قسم کا امتحان لے رہا تھا، یا پھر اس سنکی گھر میں رہنے والے لوگوں کی طرح وہ بھی ایک سنکی انسان تھا جیسا کہ وہ ہمیشہ اسے دیکھتی آئی تھی۔

"اور یہ تمھاری داڑھی اتنی سفید کیسے ہو گئی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے جب سے تمھارے بچوں کے بارے میں اطلاع ملی ہے، میں سویا نہیں ہوں۔ شاید میری داڑھی کے سفید ہونے کی یہی وجہ ہو۔ جانے بھی دو، ایک نہ ایک دن اسے سفید

ہوتا ہی تھا۔'' دربان دونوں ہاتھوں سے داڑھی کو سہلا رہا تھا۔ ''سچ پوچھو تو میں اپنی داڑھی سے تنگ آ گیا ہوں۔ اس بات کے لیے مجھے لوگوں کو ہر طرح کی کیفیت دینی پڑتی ہے۔ مگر مجھے اسے گرانے میں ڈر لگتا ہے۔ ایک بار میں ایک حجام کے پاس چلا گیا جو درخت کے نیچے گاہکوں کے لیے اپنی کرسی رکھ کر ٹرانزسٹر پر فلمی گانے لگایا کرتا تھا۔ جانتی ہو اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا، تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ اس داڑھی کے بغیر تمھارا اصلی چہرہ لوگوں کے سامنے آ جائے گا اور تمھیں چھپنے کے لیے جگہ نہیں ملے گی۔ اور میں نے حجام سے کہا، تم پہلا گھوڑا ہو جو گھاس سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔ اور میں نے اس کے لیے ٹین کا ایک شیڈ بنوا دیا تاکہ برسات میں اس کا کاروبار چلتا رہے۔ تب سے ہم لوگ دوست ہیں اور وہ مجھے مزے مزے کے قصے سنایا کرتا ہے۔''

دربان کی اس عجیب و غریب گفتگو سے لاتعلق ہو کر صالحہ محلے کے چھپروں کی طرف تاکتی رہی جن پر بلیاں چل رہی تھیں، کوے بیٹھے تھے، کپڑے اور اُپلے سوکھ رہے تھے اور ٹوکریاں اور ٹائر رکھے ہوئے تھے۔ ایک ترپال سے ڈھکی ہوئی مچان پر لنگوروں کا جھنڈ نظر آ رہا تھا جو ایک قطار میں چلتے ہوئے چھپر بدل رہے تھے۔ یہ لنگور قافلے کی شکل میں ہمیشہ کہیں نہ کہیں جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ دو آدمی چھپر پر ایک دوسرے کے روبرو کھڑے زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے جارحانہ انداز میں ہاتھ ہلانے کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی دونوں ایک دوسرے پر پل پڑیں گے۔ اسے اس پر حیرت ہوئی کہ اس سے پہلے اس نے چھپر کے اوپر کی اس دنیا کو ٹھیک طرح سے دیکھا کیوں نہ تھا۔ ہم لوگ جو نیچے کی دنیا میں جیتے ہیں، ہمیں اوپر کی زندگی کا پتا ہی نہیں ہوتا۔

پھر اسے دربان کا خیال آیا جس نے ابھی ابھی اپنی بات ختم کی تھی۔ یقیناً وہ میرا ذہن بھٹکانے کے لیے یہ سب کہہ رہا ہے۔

''گھر پر سب ٹھیک ہیں؟'' اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''نہیں، گھر پر کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' دربان اٹھ کر اپنے چوتڑ جھاڑنے لگا۔ ''مالکن کے دونوں بچے آ چکے ہیں اور لالٹین والی بلی اچانک کہیں چلی گئی ہے۔ میں نے بہت تلاش کی، مگر نہیں ملی۔ شاید وہ کہیں جا کر مر کھپ چکی ہو۔''

''مجھے بچوں کے بارے میں پتا ہے۔'' صالحہ نے آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے اس میں

اپنے دونوں بچے شاخ سے لٹکتے نظر آ رہے تھے۔ ''اور بلی کے بارے میں سن کر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔''

''مجھے گھر سے نکلے بہت دیر ہو گئی ہے۔ مالک گھبراتے ہوں گے۔ مالکن کئی دنوں سے بیمار چل رہی ہیں، بلکہ تمھارے بچوں کے واقعے نے ان پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ میں نے تم سے کیا کہا تھا، اپنا نام بدل لو، مگر تم نے نہیں سنا۔ کیا تم پھر سے کام پر آنے کے بارے میں سوچ رہی ہو؟ اس بار میرے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کرنا۔''

''کیا مجھے آنا چاہیے؟ انھوں نے اب تک دوسرا آدمی نہیں رکھا؟''

''تم یہ سوچ بھی کیسے سکتی ہو؟'' دربان نے آخری بار شہر کی طرف دیکھا۔ ''جانے کیوں میں جب بھی اس شہر سے جانے کے بارے میں سوچتا ہوں، میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے پل سے گزرتے ہی میری زندگی ختم ہو جائے گی، میرا مطلب ہے پل کے اُس پار کیا ہے بھلا، کچھ تو اس کا پتا ہو، یا پھر شاید میرے لیے وہاں پر سرے سے کوئی دنیا ہی نہ ہو یا پھر جانے کون سی دنیا انتظار کر رہی ہوگی۔ سچ پوچھو تو یہ ایک عجیب ڈر ہے جسے میں سمجھ نہیں پاتا، مگر اب میرے اندر اسے آزمانے کی ہمت آ گئی ہے اور میں اس پل سے گزرنے کے بارے میں سوچنے لگا ہوں، بلکہ میں نے کل ہی خواب میں دیکھا کہ میں اپنا بوریا بستر اٹھائے اس پر کھڑا ہوں اور نیچے دریا میں طوفان آیا ہوا ہے۔ مالک نے کہا ہے، تم جتنا وقت چاہو لے سکتی ہو مگر تمھیں پھر سے کام پر لوٹ آنا ہے۔ اور صالحہ...'' دربان نے مڑ کر اس کی طرف آخری بار دیکھا۔ ''تم واقعی ایک مضبوط ارادوں والی عورت ہو۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، تم جلد ان سب چیزوں سے باہر نکل آؤ گی۔ تمھیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔''

''جیسے ان چیزوں سے باہر بھی کوئی دنیا ہے،'' صالحہ نے خود سے کہا۔

''ہے نا!'' دربان نے اپنا سر ہلایا۔ ''ہمیں امید نہیں ہارنی چاہیے۔ اوپر والا اگر ایک دروازہ بند کرتا ہے تو کئی کھول دیتا ہے۔''

وہ صحن پر بیٹھی دربان کو ڈھال پر بتدریج مختصر ہوتے دیکھتی رہی۔ اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟ اب جبکہ اس کے پاس کچھ بھی بچا نہ تھا، وہ کون سی چیزیں تھیں جن سے وہ نکلنا چاہتی تھی؟ وہ واپس گھر لوٹی تو اسے گھر اور بھی ویران نظر آیا۔ وہ مٹی کے چولھے کے سامنے بیٹھ کر چمٹے کی مدد سے اس کے کنجوں سے راکھ گرانے لگی۔ اس نے کئی دنوں سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ گھر کے ہر کونے سے پرچھائیاں اُمڈ رہی

تھیں۔ ہر قدم پر اس کے پیچھے سرسراہٹ جاگ اٹھتی، کسی کی سرگوشی سنائی دیتی، چھپر سے کوئی پرندہ پر پھڑپھڑا کراڑتا محسوس ہوتا۔ مگر ان چیزوں سے اب اسے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔

اب تو اس گھر میں بلیاں تک نہیں۔ پھر وہ مڑکر کیوں دیکھے!

29

بچوں کی تدفین کے ساتویں دن شہر کا موسم اچانک بدل گیا۔ صبح دیر تک سورج زمین کے کنارے تندور کی مانند دہکتا رہا پھر کسی نارنجی گیند کی طرح اچھل کر آسمان پر چلا آیا۔ کچھ گھنٹوں کے لیے دنیا پوری طرح روشن ہوگئی جیسے اس سے غم کے بادل چھٹ گئے ہوں اور لوگوں کی زندگی معمول پر آگئی ہو۔ مگر دوپہر کی طرف شمال کی طرف سے کالے کالے بادل امڈ آئے اور انھوں نے دیکھتے دیکھتے سورج کا نشان مٹا دیا۔ ابھی ٹھیک طرح سے سہ پہر بھی نہ ہو پائی تھی کہ چاروں طرف شام کا دھندلکا پھیل گیا، یہاں تک کہ چڑیاں تک فریب کھا کر درختوں میں چہچہانے لگیں۔ لوگوں نے حیران ہوکر دیکھا، آسمان کے اندر ایک بڑی تبدیلی نظر آرہی تھی جیسے وہ واپس اپنے اندر مڑنے لگا ہو۔ مڑتے ہوئے آسمان پر مہاجر پرندے پروں کو گردش دیتے ہوئے تیزی سے اپنے اندر غائب ہوتے جارہے تھے۔ پرندوں کی بچی کھچی ڈار مڑتے ہوئے آسمان کے ساتھ ثابت وسالم غائب ہوتی جارہی تھی۔ ہوا میں افراتفری شروع ہوچکی تھی۔ ایک بوڑھی عورت اپنے ٹیڑھے میڑھے دانتوں کے ساتھ، جو اس کے منھ سے باہر نکلے ہوئے تھے، جانے کہاں سے نکل آئی تھی اور ہوا سے لڑ رہی تھی۔ اس کے پاس نرسل کی ایک بڑی سی ڈھکن والی ٹوکری تھی۔ وہ صالحہ کے دروازے پر پہنچ کر گلی کے بیچوں بیچ بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"اس کا انتظار فضول ہے۔ اب وہ اپنے گھر سے نہیں نکلنے والی۔ اب اس کی لاش ہی گھر سے باہر آئے گی،" صالحہ کے گھر کے باہر دائمی طور پر منڈلانے والے شخص نے بوڑھی عورت کے کان میں سرگوشی کی۔ جانے اسے کیوں ایسا محسوس ہوا تھا جیسے یہ بوڑھی بہری ہو۔ "اور تم خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کر رہی ہو نانی۔"

"اور تم خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کر رہی ہو نانی!" بوڑھی عورت نے اس شخص کے الفاظ ہو بہو

دہرائے اور اپنے بھوتنی جیسے دانتوں سے ہنس دی۔ کچھ دیر بعد وہ صالحہ کے گھر سے دور سرکاری کنویں کے صحن پر دکھائی دی۔ اسے محلے کی سڑک چھاپ بلیوں نے گھیر رکھا تھا جنھیں وہ چاٹنے کے لیے اپنی انگلیاں پیش کر رہی تھی۔ وہ رہ رہ کر اپنے سر سے جوں نکال کر دونوں ناخنوں کے بیچ رکھ کر مارتی اور اس کے بے ہنگم دانت ننگے ہو جاتے۔ شام سے پہلے شدید بارش اتر آئی جو رات کے دوسرے پہر اور بھی تیز ہوگئی اور ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ صبح کاذب تک محلہ پانی میں ڈوب چکا تھا اور ٹھنڈی ہوا میں لوگوں کے دانت بج رہے تھے۔ وہ وقت جب سورج نکلنے کو تھا اور رہے سہے بادل آسمان سے وداع لے رہے تھے، لوگوں نے دیکھا، بوڑھی عورت کنویں کے صحن سے غائب تھی۔ وہ لوگ اسی کے بارے میں بات کر رہے تھے بلکہ احتیاطاً کنویں کے اندر بھی جھانک رہے تھے جب انھوں نے صالحہ کو گھر سے باہر آکر دروازے پر قفل چڑھاتے دیکھا۔ اس کے کندھوں پر ایک سبز رنگ کی شال لپٹی تھی اور وہ ایک بلی کی زنجیر تھامے ہوئے تھی۔

"اللہ حافظ گھر، تم ویسے بھی ہمارے کبھی نہ تھے،" صالحہ نے گھر کے گیلے چوکھٹ کو چومتے ہوئے کہا اور اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل آئے تھے۔ "میری زندگی میں جو بھی اچھا یا برا تھا وہ میں نے تیرے اندر ہی دیکھا ہے۔"

گھر کی گیلی دیواریں چھپروں کا بوجھ اٹھائے چپ کھڑی اس کی طرف تاک رہی تھیں۔ شاید ان کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ وہ کنویں کے سامنے پہنچ کر لوگوں کی متجسس بھیڑ کے سامنے رک گئی جو اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ محلے کا زیادہ تر پانی نکل چکا تھا۔

"آپ لوگوں نے کسی بوڑھی عورت کو دیکھا ہے؟" اس نے زنجیر جھٹک کر بلی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے دانت بہت ہی گندے ہیں۔ یہ بلی اسی کی ہے۔"

"ہاں ہاں، وہ ساری رات سرکاری کنویں پر بیٹھی محلے بھر کی بلیوں کے ساتھ بھیگتی رہی تھی اور صبح ہوتے ہی جانے کہاں غائب ہوگئی۔ مگر اس کے پاس کوئی پالتو بلی تو نہ تھی صالحہ، وہ تو محلے کی سڑک چھاپ بلیاں تھیں۔"

"یہ بلی اسی کی ہے۔" صالحہ نے اپنی بلی کی طرف اشارہ کیا اور محلے والوں کو اس کے اندر ایک عجیب سرد مہری دکھائی پڑی۔ "وہ میری سگی ماں تھی۔ اسی نے مجھے یتیم خانے میں ڈالا تھا۔ بعد میں وہ

میرے پوس پالک باپ سے پیسہ وصولا کرتی تھی۔ اسے بے موقع محل دکھائی دینے کی بری عادت ہے۔ مگراس بار جانے وہ کس لیے آئی تھی۔ میں اس سے ملنا نہیں چاہتی۔"

اس نے مشرقی افق سے سورج کے سیاہ گولے کو بادلوں کو چیر کر باہر آنے کی جدو جہد کرتے دیکھا۔ اس سے نکلتی کرنوں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔ صالحہ گیلی سڑک پر چلتے ہوئے جس کے دونوں کنارے کی نالیوں میں کیچڑ جمی ہوئی تھی، آسمان سے بادلوں کو ست روی سے گزرتے دیکھ رہی تھی جس کے ساتھ ہی وہ اپنی ماں کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی، جس نے یتیم خانے میں ڈالنے کے بعد کبھی اس کی کوئی خبر نہیں لی تھی، مگر اتنے طوفان میں جانے کہاں سے ایک بلی کے ساتھ نازل ہو گئی تھی۔ چوراہے سے کچھ سو قدم آگے چل کر وہ رک گئی اور اس نے مڑ کر اپنے محلے کی طرف دیکھا جس کے چھپروں کے اوپر کالے آسمان کا شامیانہ تنا ہوا تھا۔ وہ کئی منٹ تک اپنی جگہ چپ کھڑی اپنے گھر کی طرف تاکتی رہی جو اپنی اونچائی اور دیوار سے نکلے ہوئے طفیلی پودوں کے سبب جو چھپر سے اپنی گھنی شاخوں اور ٹہنیوں کے ساتھ اوپر نکلے ہوئے تھے، آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا، اور اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے دالان اور اس سے لگے چھپر سے دھواں نکلنے لگا تھا جو ہوا کے زیرِ اثر اِدھر اُدھر ہوتا ہوا پھر اپنی لکیر پر استوار ہو جاتا۔ کچھ ہی دیر کے اندر چھپر کے اوپر کا آسمان آس پاس کے مقابلے سیاہ ہو گیا اور کھپریلوں سے آگ کی لپٹیں بلند ہونے لگیں۔ یہ لپٹیں دالان گھر کی کھڑکیوں سے بھی باہر آ رہی تھیں۔ محلے سے چیخ پکار سنائی دینا شروع ہو گئی تھی۔ کنویں کی طرف کچھ لوگ ڈول اٹھائے بھاگتے نظر آئے۔ محلے کی گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے، لوگ چلا رہے تھے اور عورتیں چیخ رہی تھیں۔ اور جبکہ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا اور گلی کے اندر ہر کسی کو اپنے گھر کی پڑی تھی، صالحہ نے آخری بار اپنے چھپر کی طرف دیکھا جو اب پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنی بلی کے ساتھ شہر کی طرف چلی گئی۔

30

گھر کا پھاٹک بند تھا جس کے سامنے کھڑی وہ برآمدے کی طرف تاک رہی تھی جس پر رکھی لالٹین جل رہی تھی۔ مشرقی آسمان کے کنارے سے سورج بادل کی پرت چیر کر پوری طرح نکل آیا تھا اور

اس کی روشنی نے دیوار پر جمائے ہوئے شیشوں پر ان گنت قوسِ قزح بکھیر رکھے تھے۔ دوسری طرف پھاٹک کے جنگلوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ شاید کوئی من موجی بادل پانی برسا کر ابھی اِدھر سے گزرا تھا۔ دربان اس کی آہٹ پر اپنی کھڑکی پر نظر آیا اور اس کے گھر کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور دورخی داڑھی میں ایک عجیب بدنظمی نظر آ رہی تھی۔ حیرت سے صالحہ کی بلی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ پھاٹک کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

"آج سے پہلے تم کبھی کسی بلی کے ساتھ نظر تو نہیں آئی تھیں صالحہ؟" پھاٹک کھول کر اس نے بلی کو زمین سے اٹھا کر پیار سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔ "اتنی پیاری بلی میں نے کم دیکھی ہے۔"

"اسے اپنے گھر میں دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ اسے کہاں ہونا چاہیے،" صالحہ نے بلی کو دربان سے واپس لے لیا۔ "میں قدرت کے کارخانے کو تھوڑا بہت سمجھنے لگی ہوں۔ میری ماں ایک پاگل عورت ہے مگر اسے صاف صفائی کا جنون ہے۔ یہ بلی اسی کی ہے۔"

"رات مالکن کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی تھی۔ ہمیں رات بھر جاگنا پڑا۔ ڈرائیور ابھی ابھی گھر گیا ہے۔ مالک انھیں اسپتال لے جانا چاہتے تھے مگر مالکن نے انکار کر دیا،" دربان نے پھاٹک اس کے پیچھے بند کرتے ہوئے کہا۔ "انھیں رات بھر آکسیجن چڑھا کر رکھا گیا تھا۔ جانے اب ان کی طبیعت کیسی ہے۔ ذرا مجھے بتا کر جانا۔"

برآمدے پر چڑھ کر صالحہ نے لالٹین اٹھالی اور پیچ گھما کر اس کی لو تیز کر دی۔ لو اونچی تو ہوئی مگر آسمان پر پھیلتی سورج کی افقی کرنوں کے سبب وہ اضافی نظر آ رہی تھی۔ برآمدے سے گزر کر وہ راہداری میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا، تمام کمرے تاریک پڑے تھے۔ لالٹین کے ساتھ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی، پرچھائیاں پیچھے کی طرف بھاگ رہی تھیں اور نئی پرچھائیاں آسیبوں کی طرح سامنے سے آتی چلی جا رہی تھیں۔ گھر کے اندر مقبرے جیسی خاموشی تھی۔ کہیں کسی بلی کا نام و نشان نہ تھا۔ خاتونِ خانہ کا کمرہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی کھڑکیوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی صالحہ کا لالٹین والا ہاتھ اوپر اٹھا اور اس کی روشنی پلنگ کے سرہانے رکھے تکیے پر پڑی جس پر خاتونِ خانہ کا سر دھرا ہوا تھا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں چھت کی طرف تاک رہی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھ پتھر کی طرح سینے پر رکھے ہوئے تھے۔

جپ کھڑا تھا۔
مکان مالک اپنے تین بچوں کے ساتھ پلنگ کے پائتانے چپ کھڑا تھا۔

صالحہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والی تھی کہ مالک مکان نے لپک کر اسے سنبھال لیا۔ احتیاط سے کرسی پر بٹھا کر، جو کل تک ڈاکٹر اور ملاقاتیوں کے لیے مخصوص تھی، اس نے لالٹین صالحہ کے ہاتھ سے لے کر پلنگ کے سرھانے رکھی میز پر رکھ دی جس کی سنگ مرمر کی سطح پر دوائیوں کی ان گنت شیشیاں چمک رہی تھیں۔ آج طاق پر کوئی بلی موجود نہ تھی۔ لالٹین کی روشنی میں خاتونِ خانہ کی پیشانی چمک اٹھی مگر آنکھیں تاریک گڈھوں میں ڈوب گئیں۔ صالحہ سانس روکے ساکت جسم کی طرف تاک رہی تھی۔

اسے لگا، وہ بستر پر خاتونِ خانہ کے ٹھنڈے جسم کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے مڑکر بچوں کی طرف دیکھا جو ایک دوسرے سے لگے ساکت و جامد کھڑے تھے۔ اسے اپنی طرف تاکتے دیکھ کر وہ اس کے قریب آ گئے۔ چھوٹے بچے کو تو وہ پہچانتی تھی، مگر باقی دونوں بچوں کو کیسے بھول سکتی تھی جو اس کے جڑواں بچوں کی عمر کے ہی تھے اور انھی کی طرح اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف تاک رہے تھے۔

''تم اپنے آنسو بیکار ضائع کر رہی ہو، صالحہ،'' مالک مکان نے اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ اس نے محسوس کیا، یہ کسی اجنبی کی انگلیاں نہیں تھیں۔ وہ تو اس لمس کو برسوں سے جانتی تھی۔ اس کی نظر سنگ مرمر کی میز پر گئی جہاں پر رکھی دوا کی شیشیاں اب کسی کام کی نہیں رہ گئی تھیں۔

''اتنا سب کچھ کھونے کے بعد وہ غریب عورت کیسے زندہ رہ سکتی تھی۔'' مکان مالک نے آگے بڑھ کر مریض کی کھلی آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر پپوٹے بند کر دیے۔ ''تم پریشان نہ ہونا۔ اس کے ساتھ اس سے برا اور کیا ہو سکتا تھا؟ دنیا میں اس کا ہے ہی کون جس کے لیے وہ زندہ رہتی؟ آؤ اس کے کفن دفن کا انتظام کریں۔''

صالحہ حیرت سے مکان مالک کی طرف تاک رہی تھی جب اس کے پیروں پر بلی کلبلائی جو اپنی زنجیر گھسیٹتی ہوئی کسی سائے کی طرح پلنگ کے نیچے سے نکل آئی تھی جہاں زنجیر صالحہ کے ہاتھ سے چھوٹتے ہی وہ جا گھسی تھی۔ لالٹین کی تیز روشنی میں اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس نے بلی سے نظر ہٹا کر مکان مالک کی طرف دیکھا۔ کیا وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی؟

''تم اتنی اجنبی آنکھوں سے میری طرف کیوں دیکھ رہی ہو، صالحہ؟''

''سارا گھر کیوں تاریک پڑا ہے؟'' اسے خود اپنے جملے پر حیرت ہوئی۔ ''ہر طرف پرچھائیاں نظر آ رہی ہیں۔ بچے ڈر جائیں گے۔''

''کل رات شدید طوفان آیا تھا۔ ہماری چیل کوٹھی کا چھپر باغ میں ایک درخت پر جا گرا ہے۔ تب سے بجلی نہیں آئی ہے۔''

''اور بلیاں؟''

''اندھیرے میں گھر کی تمام بلیاں جانے کہاں چلی گئی ہیں۔ انھیں کسی نے جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، نہ ہی دربان کو اس بات کا علم ہے۔'' مکان مالک حیرت سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ ''مجھے حیرت ہے، یہ سب بتانا پڑ رہا ہے۔ لگ رہا ہے، صالحہ کی موت نے تم پر بہت برا اثر چھوڑا ہے۔''

''نہیں،'' صالحہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''ہماری اس دنیا میں سب کچھ گڈمڈ ہو چکا ہے۔ وہ دربان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مگر تم وعدہ کرو، تم اسے عزت و احترام سے دفناؤ گے۔ اور جب سارا کام ختم ہو جائے تو باغ کے لیے ایک مالی رکھ لینا جو ٹھیک طرح سے باغ کی رکھوالی کر سکے۔ ان بچوں نے بہت دکھ جھیلا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ باغ پھر سے پیڑ پودوں سے ڈھک جائے اور اس میں چڑیاں چہچہایا کریں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو صالحہ؟'' مکان مالک کی آنکھیں حیرت سے ابل آئی تھیں۔ ''یہ تمھارا گھر ہے، تم اس طرح بات کر رہی ہو جیسے تم یہاں پر موجود نہیں ہو۔ تم جو چاہتی ہو اسے ہونے سے کون روک سکتا ہے؟''

''اور میں تمھیں یہ بھی بتا دوں، اس گھر کو ایک نئے دربان کی ضرورت ہوگی۔ دربان کام چھوڑ چکا ہے۔ وہ کسی بھی دن چلا جائے گا۔ وہ ایک اچھا آدمی ہے، خدا کے لیے اسے نہ روکنا۔ اور اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آجکل شہر میں بڑی تعداد میں لوگ آنے لگے ہیں۔ تمھیں اپنا آدمی مل جائے گا۔''

''اس دربان کو کھو کر ہمیں افسوس ہوگا، مگر اطمینان رکھو، ہم اپنا آدمی ڈھونڈ لیں گے۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اور اب ایک آخری بات جو شاید میں کبھی کہہ نہ پاتی اگر ہم دونوں کی ملاقات نہ ہوتی،'' صالحہ نے بستر پر پڑے ہوئے بے جان جسم کی طرف اشارہ کیا۔ ''آج میں جان چکی ہوں، ہم الگ الگ دنیا میں جیتے ہوئے بھی ایک ہی زندگی جی رہے تھے۔ ہم نے ساری زندگی ایک ہی بستر پر گزاری ہے، ایک ایسا بستر جس میں پہلے دن سے ہی برف بھر دی گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے

سے نہ ملے ہوتے تو شاید کبھی اس برف کو سمجھ نہ پاتے۔ لیکن اب وہ برف پگھل چکی ہے۔''

''صالحہ، میں نے تمھیں ایک اچھی زندگی دی ہے۔''

''ہاں، ایک ٹھنڈا بستر اور زندگی بھر کی تنہائی، یہی تھی وہ ہماری زندگی جسے ہم ہمیشہ جیتے رہے۔'' صالحہ نے بستر پر پڑے ہوئے بے جان جسم پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ''سچ کہوں تو اب مجھے یاد بھی نہیں کہ میں کون ہوں اور وہ جو اس ٹھنڈے بستر پر پڑی ہوئی ہے وہ کون ہے۔''

اس نے پلنگ کے نیچے ٹٹولتے ہوئے بلی کی زنجیر تھام لی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بلی کے ساتھ کمرے سے باہر جا رہی تھی جب مکان مالک اس کے پیچھے پیچھے برآمدے پر نکل آیا۔ آسمان میں سورج تھوڑا اوپر آ گیا تھا، مگر آدھی دنیا تاریک پڑی تھی۔ خود گھر پر تیز بارش شروع ہو گئی تھی جبکہ سڑک سوکھی پڑی تھی۔

''تم کہاں جا رہی ہو صالحہ؟'' مکان مالک کی آواز آئی۔ ''ہمارے بچوں کا کیا ہوگا؟''

''انھیں تنہا رہنے کی عادت ہے۔ مجھے تو بہت پہلے یہاں سے چلا جانا چاہیے تھا۔''

''میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، یہ دنیا ہر جگہ ایک جیسی ہے۔ لوٹ آؤ صالحہ۔''

''نہیں، میرے پاس لوٹ آنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہے۔''

وہ جیسے جیسے بلی کی زنجیر تھامے سیڑھی اتر رہی تھی، چھت سے، دالان سے، دیواروں سے، روشن دانوں سے، ستونوں کے کارنس سے، یہاں تک کہ باہر لٹکتی جھلملیوں کے اوپر سے بلیاں اتر رہی تھیں اور بغیر کوئی آواز پیدا کیے صالحہ کے سائے میں ضم ہوتی جا رہی تھیں۔ دربان پھاٹک پر چپ کھڑا، بارش میں بھیگتا ہوا، یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے چپ چاپ پھاٹک کھول دیا تھا۔ صالحہ نے مڑ کر ایک آخری نظر گھر پر ڈالی اور بلیوں کے ساتھ بارش کی دھند میں غائب ہو گئی۔

اپنی کوٹھری کے اندر جا کر دربان نے کھڑکی سے دیکھا، بارش میں گھر کا سارا رنگ و روغن اتر تا جا رہا تھا، کھڑکیوں اور دروازوں کے چوکھٹ اور جھلملیوں سے پینٹ کی پپڑیاں گرنے لگی تھیں اور دیواروں کے پلاسٹر مٹی کی طرح پگھلتے ہوئے نالوں کے اندر جا رہے تھے۔ صرف برآمدے میں رکھی لالٹین بارش میں ڈوبی ہونے کے باوجود اپنی تیز لو پھینک رہی تھی۔

31

آسمان پر دھند چھائی ہوئی تھی جس میں سورج کسی مکڑی کے جالے کی طرح نظر آ رہا تھا جب دربان چوراہے پر نمودار ہوا اور کنویں کے صحن کے سامنے رک کر محلے کے جلے ہوئے گھروں کی طرف دیکھنے لگا جو دھند میں ڈوبے ہونے کے باوجود دوسرے گھروں کے مقابلے زیادہ سیاہ نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے خالی ہاتھ جیکٹ کی جیبوں کے اندر ڈالے کھڑا تھا۔ اس کے لیے یہ طے کرنا مشکل نہ تھا کہ ان جلے ہوئے گھروں میں دالان والا گھر کون سا تھا کیونکہ اس کا پورا چھپر ڈھے جانے کے باوجود سب سے اونچی دیوار اپنے طفیلی درختوں کے ساتھ اب بھی کھڑی تھی گرچہ آگ کی تمازت میں وہ مرجھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

وہی شخص جو صالحہ کے گھر کے باہر منڈلایا کرتا، کنویں کے پیچھے سے نمودار ہوا۔

''تم اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ پہلے کبھی جلا ہوا گھر نہیں دیکھا کیا؟'' وہ دربان کی طرف غصے سے تاک رہا تھا۔

''نہیں،'' دربان نے کہا۔ ''اس معاملے میں میں بدنصیب انسان ہوں۔''

''پھر انھیں اچھی طرح سے دیکھ لو۔ ان میں ایک بدنصیب عورت کا گھر بھی تھا جو کل ہی نہر کے کنارے دفنائی گئی ہے۔ پچھلے چھ مہینوں میں اس کا ہر کوئی مارا جا چکا ہے۔ خدا کا شکر ہے رات کو بارش ہو گئی تھی، ورنہ ساری بستی جل کر خاک ہو چکی ہوتی۔''

''مجھے پتا ہے،'' دربان نے کہا۔ ''یہ میرے لیے کوئی نئی خبر نہیں۔ اس خبر کو سنانے کے لیے تم کسی اور کو ڈھونڈ لو۔'' اور وہ مڑ کر واپس چل پڑا۔

32

دریا میں طوفان آیا ہوا تھا۔ پل پر ہوا تیز چل رہی تھی۔ اس کے داخلے پر ایک بوڑھی عورت کنکریٹ کے فٹ پاتھ پر بیٹھی، انگیٹھی پر پنکھا جھلتے ہوئے، شکر قند سینک رہی تھی۔ دہکتے انگاروں پر رکھی لوہے کی جالی پر بغیر چھلے ہوئے شکر قند رکھے سلگ رہے تھے جن سے کالا دھواں اٹھ رہا تھا۔ کچے شکر قند اور کوئلوں سے بھری بوریاں پاس ہی دھری ہوئی تھیں جن پر رکھے ٹوکرے کے پنجڑے کے اندر ایک

ولایتی چوہا اپنے پچھلے پنجوں پر بیٹھا ایک کچے امرود کو دونوں ہاتھوں سے تھامے اس پر دانت تیز کر رہا تھا۔

"نانی، تم نے کسی عورت کو پل سے گزرتے دیکھا ہے؟" دربان نے اس کے سامنے رک کر کوئلوں سے اٹھتے دھویں پر ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے جیکٹ کے واحد بٹن کو اس کے کاج میں ڈال لیا تھا۔ اس کی دورخی سفید داڑھی نفاست سے کنگھی کی گئی تھی۔

"وہ تو کل ہی اپنی ڈھیر ساری بلیوں کے ساتھ گزر گئی تھی۔ خود اس عورت نے ایک بلی کی زنجیر تھام رکھی تھی۔"

"ہاں، میں اسی عورت کی بات کر رہا ہوں۔" دربان نے لوہے کی جالی کے اوپر سے ایک شکر قند اٹھالیا اور دو روپے کا سکہ عورت کے جھریوں والے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"مگر تم نے تو ایک شکر قند لیا ہے جس کی قیمت ایک روپیہ ہے۔"

"یہ میرا آخری سکہ ہے۔" دربان گرم شکر قند کا چھلکا اتارتے ہوئے بھاپ پر پھونک مار رہا تھا۔ "اس شہر میں میں نے پندرہ برس کام کیے، مگر میرے پاس بس یہی دولت بچی ہے۔ مجھے اس جگہ سے جانا ہے۔ یاد رکھو، اگر تم نے باقی پیسہ لوٹا دیا تو میں کبھی اس پل کے پار نہیں جا پاؤں گا۔"

بڑھیا کو پیسہ بوری کے نیچے رکھتے دیکھ کر وہ شکر قند چباتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ پل کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا تھا جب اس نے مڑ کر آخری بار شہر پر نظر ڈالی جس کے مکانات اور راستے دھند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نیم تاریک آسمان پر جگہ جگہ فیکٹری کی چمنیاں شعلے اگل رہی تھیں۔ پل کے دوسرے سرے پر ولایتی چوہے کے پنجڑے کے ساتھ بوڑھی عورت خود اپنی انگیٹھی کے دھویں میں چھپتی جا رہی تھی۔ اسی وقت ایک ادھیڑ عمر کا شخص، جس کا سر گنجا تھا اور کندھے غیر معمولی طور پر جھکے ہوئے تھے، ایک بقچہ بغل میں دبائے پل کے اندر داخل ہوا۔

"تم اس شہر کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟" بقچہ دوسری بغل میں منتقل کرتے ہوئے وہ دربان کے سامنے رک گیا۔ "پل کے اس پار تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اسی لیے تو میں جا رہا ہوں۔ لیکن پل سے گزر کر تم جس شہر کے اندر جاؤ گے اسے کبھی سمجھ نہ پاؤ گے، اسی لیے حیران ہونے کی عادت ڈال لو،" دربان نے کہا اور شکر قند چباتا ہوا پل سے باہر چلا گیا۔

٭٭